سرو زندگی

اصغر حسین اصغر

قیمت ع ۴/

بارِ اوّل پانچصد

پبلشر نازپبلشنگ ہاؤس دہلی

فہرست

دیباچہ

"نشاطِ روح" کو اکثر بزرگوں اور دوستوں نے پسند فرما کر میری حوصلہ افزائی کی۔ جس کے لئے اُن کا منت گزار ہوں۔ بعضوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی اُن کا بھی اس لئے ممنون ہوں کہ اُنہوں نے اپنے خیال میں میری کوتاہیوں اور خامیوں کو گوارا نہیں فرمایا میں نیتوں کا محتسب نہیں مجھے تو شکوہ سے زیادہ مزہ شکریہ میں ملتا ہے۔

اِس اثناء میں وقتاً فوقتاً کچھ اور اشعار جو کہے تھے وہ آج "سرورِ زندگی" کے نام سے ناظرین کرام کے سامنے پیش ہیں۔ سہو جو لازمۂ بشریت ہے اس کا دلی اعتراف ہے بلکہ بقول غالب ؎

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام
آشکارا دم ز عصیاں می زنم

بایں ہمہ ایک چیز کو کچھ لوگ پسند کرتے کچھ ناپسند اور اسمیں وہ قطعاً

معذو بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ پسندیدگی کا دار و مدار اکثر طبائع کی۔ مناسبت اور عدم مناسبت پر ہے۔ اس لئے کہ بحث دلیل انتقاد، جو چاہیئے لفظ استعمال فرمایئے۔ مگر وہ سب نام ہے اسی مناسبت و عدم مناسبت کی توضیح و تشریح کا اور بس۔

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو بالقابہٗ اور مولانا ابوالکلام آزاد نے زبانی میری بہت کچھ ہمت افزائی فرمائی۔ جب کتاب کے چھپنے کا موقع آیا تو اپنے خیالات و تاثرات قلمبند فرماکر بھی مرحمت فرمائے۔ اس کے لئے ہمہ تن سپاس ہوں۔

یہ چند سطور ایسی حالت میں لکھ رہا ہوں کہ فالج سے صاحب فراش ہوں جو کچھ اور جسقدر لکھنا چاہتے تھا۔ وہ ہو نہ سکا۔ اُمید ہے کہ احباب معاف فرمائینگے۔

احقر

اصغر

مقدمہ

از رائٹ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو ایم اے۔ ایل ایل ڈی کے، سی، ایس آئی، پی، سی

فی زمانہ دنیائے ادب میں جو شہرہ مولوی اصغر صاحب نے حاصل کیا ہے اس سے میں بہت عرصہ سے واقف ہوں لیکن پچھلے تین چار سال سے جب سے موصوف کا ہندوستانی اکیڈیمی سے تعلق ہوا ہے مجھے خوش نصیبی سے آپ کے علمی مضامین پر غور کرنے اور آپکے کلام کے سننے کا اکثر موقع ملا ہے لہذا میں جو اس وقت آپ کی نسبت لکھوں گا وہ رسمی نہیں بلکہ ذاتی تجربہ اور واقفیت پر مبنی ہوگا۔ نہ میں شاعر ہوں اور نہ سخن شناسی کا مجھے دعویٰ ہے۔ میں اس سے بھی بخوبی واقف ہوں کہ ہندوستان میں کسی ایک شاعر کی تعریف کرنا اس کے ہمعروں سے مخالفت مول لینا ہے لیکن اس قسم کی تنگ نظری اگر کسی حیثیت سے جائز ہو سکتی ہے تو بے لوث خیالات کے اظہار کی خواہش اس سے کہیں زیادہ قدرتی ہے۔

آجکل عام طور پر اخباروں اور رسالوں میں جو قدیم و جدید شعرا کے بارے میں مضامین نکلتے ہیں اُن میں زیادہ تر لفظی مباحثے ہوتے ہیں کسی کی زبان و محاورہ پر اعتراض ہوتا ہے کسی کی ترکیب الفاظ

پر نکتہ چینی ہوتی ہے اور کسی پر سرقہ کا الزام لگایا جاتا ہے مگر نفس سخن پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے صد ہا سال سے نقادان سخن میں یہ بحث ہوتی رہی ہے کہ صحیح معنوں میں شعر کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ٹھیک اصلاحی رنگ میں دینا آسان نہیں ہے لیکن معمولی نقطۂ نظر سے کچھ عرض کر دینا بیجا نہ ہوگا جب کوئی کلام ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم قدرتی طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ کیا کہا گیا ہے؟ اور کس طرح کہا گیا ہے؟ جو کچھ کہا گیا ہے ممکن ہے کہ وہ ایک بلند حقیقت ہو لیکن بغیر طرز بیان کی خوبی کے اس پر شعر کا اطلاق نہیں ہوتا اسی طرح طرز بیان کی چمک دمک بھی بغیر خیالات عالیہ کے شعر کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ مختصر یہ کہ شعر اگر زبان محاورہ اور بندش الفاظ کے لحاظ سے درجۂ کمال پر پہنچ جائے اور اس میں کوئی ایسا خیال موجود نہ ہو جو ہمارے اندر ایک طرح کی ہلچل پیدا کر سکے تو ایسے شعر کو جو چاہے کہے مگر اس کا شاعری سے تعلق نہیں اگر میری یہ رائے صحیح ہے تو پھر شعر کی تعریف یہ ہے کہ بہترین بات بہترین اسلوب کے ساتھ" یا پھر حسن تخیل و حسن بیان کا مجموعہ"

ہر ملک میں شاعری زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہے۔ مثلاً انگریزی زبان میں شعراء سے اگر مقابلہ کیا جائے تو زمین اور آسمان کا فرق ملے گا اگر آجکل پوپ ہوتا اور اس قسم کی نظمیں لکھتا جیسی اس کے زمانہ میں مقبول ہوئیں تو اس کی کیا قدر ہوتی اسی طرح انیسویں یا بیسویں صدی کے انگریزی شعراء اگر پوپ کے زمانہ میں ہوتے اور اپنا موجودہ کلام پیش کرتے تو اس کا کیا

حشر ہوتا اس کلیے سے اُردو شاعری بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتی اگر آج امانت یا اور اُن کے قبیل کے شعرا موجود ہوں تو ظاہر ہے کہ ان کا کیا انجام ہو سکتا ہے اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ کچھہ شاعر دنیا میں ایسے بھی ہوئے ہیں جو اپنے وقت کی رسم شاعری سے آزاد تھے۔ تاہم اُن کی شاعری کا اثر اس وقت تک قائم رہے گا جس وقت تک انسان میں جذبات و تخییلات کا عنصر موجود ہے۔ بعض شاعر ایسے ہوئے ہیں جن کی نسبت یہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ وہ قبل از وقت پیدا ہوئے۔ مثلاً **غالب**، اُس نے خود ہی کہا ہے۔ ؎

کوکبم را در عدم اَوجِ قبولی بُودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شُدن

شاید اسی خیال کی بنا پر سر محمد اقبال نے بھی اپنی نسبت "شاعرِ فرداستم" کہا۔ غالبؔ کی قدر جو فی زمانہ ہوئی ہے وہ اس کے ہمعصروں میں نہیں ہوئی کچھہ تو رشک و حسد اور کچھہ اس زمانہ کی عام لپست خیالی کے باعث لوگ غالبؔ کو صحیح طور پر نہ سمجھہ سکے۔ عام مشاعرہ پسندوں کا ذکر نہیں اس زمانہ میں جو لوگ صحیح طور پر اُردو ادب کا ذوق رکھتے ہیں۔ اُن کو حُسن عِشق کے بیجان اور رسمی قِصّوں کے سننے کی نہ تاب ہے، نہ فرصت تغزّل کا رنگ روز بروز بدلتا جارہا ہے۔ تیس برس کے پہلے کی غزلوں کو اگر آجکل کی غزلوں سے مقابلہ کیا جائے تو ایک بیّن فرق معلوم ہوگا۔ مَیں اُردو شاعری میں جدید رنگ پیدا کرنے

والے پانچ چھ شعرا کی طرح مولوی اصغرؔ صاحب کو بھی زمانۂ حال کے بہترین نمائندوں میں سمجھتا ہوں لیکن مستقبل میں ان کی رسائیوں کے حدود کیا ہوں گے میرے توقعات بہت زیادہ ہیں اگرچہ اس کا فیصلہ خود مستقبل کے ہاتھ میں ہے۔

شعر کی سوانحمری سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لازم نہیں ہے کہ اگر کوئی شاعر اعلیٰ خیال ہوا ہے تو زندگی میں اس کے افعال بھی اتنے ہی بلند رہیں گے یا اس کو یوں کہیے کہ شاعر کے قول و فعل میں مطابقت ہونا لازمی نہیں ہے مگر ایسے شاعر بھی ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی اور اپنے کلام میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولوی اصغرؔ صاحب کی شاعری اُن کی زندگی کا عکس ہے اور زرتشتیوں کے قول کے مطابق اُن کی رفتار کردار اور گفتار میں "مطابقت پائی جاتی ہے" میں اُن کی نسبت شاعرانہ مبالغہ سے کام نہیں لینا چاہتا: میں نے وقت کی عام عیب بینی و نکتہ چینی کے اندیشہ سے اپنی رائے کو معتدل رکھنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔

ہاں تو میں نے اصل شاعری کو اچھی حسن تخیل اور حُسنِ بیان کا مجموعہ بتایا ہے میں چند اشعار اپنے دعوی کے ثبوت میں یہاں پیش کرنا چاہتا ہوں یہ اشعار مختلف موضوع و مضامین پر مشتمل ہیں مگر سب پر حُسنِ تخیل اور حسن بیان کا اثر نمایاں ہے۔

کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا — خود اپنا ناظرِ نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں

یہ شعر ایک مسلسل نظم کا ہے جس کا عنوان "کیا ہوں میں" ہے اس سوال مختلف جوابات مختلف نظریوں کے تحت دیئے گئے ہیں اور آخر میں جو جواب دیا گیا ہے وہ صرف ایک بلند مرتبہ شاعر ہی دے سکتا ہے ؎

ترا جمال ہے، تیرا خیال ہے، تو ہے ÷ مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں"

یہ پوری نظم حسنِ تخیل اور حسنِ بیان کا ایک بہترین نمونہ ہے ناظرین اسے مجموعہ میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں ۔

وہ اشعار جو ذہن کے سامنے ایک پُر کیف روحانی فضا پیدا کر دیتے ہیں اُنہیں رومانی شاعری Romantic Poetry کے نام سے پکارنا غالباً بیجا نہ ہو اس طرح کے اشعار ظاہر ہے کہ تخیل کی بلندی اور طرزِ بیان کی خوبی کے بغیر تیار نہیں ہو سکتے ۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب کوئی نگاہ میں — محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں
مجاز کیسا کہاں حقیقت ابھی تجھے کچھ خبر نہیں ہے — یہ سب ہے اک خواب کی سی حالت جو دیکھتا ہے سحر نہیں ہے
شمیمِ گلشن نسیمِ صحرا شعاعِ خورشید و موجِ دریا — ہر ایک گرمِ سفر ہے ان میں مرا کوئی ہمسفر نہیں ہے
یہ تو شب کو سر بسجدہ ساکت و مدہوش تھے — ماہ و انجم کو تو سر گرمِ سفر سمجھا تھا میں

عاشقانہ مضامین ہماری مشرقی شاعری کے مہمات میں داخل ہیں لیکن اسے ابتذال و فرسودگی سے بچانا شدتِ جذبات کو قائم رکھنا اور اس میں اتنی

سنجیدگی پیدا کر دینا کہ شائستہ جماعت کے قابل ہو سکے آسان نہیں ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

لفظ ہیں نہیں بیاں نہیں یہ کوئی داستاں نہیں ٭ شرحِ نیاز و عاشقی ختم ہے ایک آہ میں

عاشقانہ انداز سے حقائق کو بیان کر جانا شاعری کا کمال ہے۔ یہ اشعار پڑھئے اور دیکھئے ؎

بیخودی میں دیکھتا ہوں بے نیازی کی ادا ٭ کیا فنائے عاشقی خود حسن بنجانے میں ہے
کم سے کم حسنِ تخیل کا تماشہ دیکھتے ٭ جلوۂ یوسف کو کیا خواب زلیخا دیکھتے
اے تو بہار رنگ رنگ وائے تو وائے آب و رنگ ٭ حسن کسی نگاہ میں عشق کسی نگاہ میں
اک میرا ہی فسانہ ز ازل تا بہ ابد ٭ یوں نہ کرنا تھا مرے سامنے رسوا مجھکو
کہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے ٭ مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

عاشقانہ مضامین میں حسنِ بیان کے ساتھ بلند ہمتی اور شریفانہ سوز و گداز کی مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

حسنِ بیان :۔

رقصِ مستی دیکھتے جوشِ تمنا دیکھتے ٭ سامنے لا کر تجھے اپنا تماشہ دیکھتے
لالہ و گل کا جگر خون ہوا جاتا ہے ٭ سب سمجھتے ہیں جو ناکام تماشہ مجھکو
ذرے ذرے میں کیا جوشِ ترنم پیدا ٭ خود مگر کوئی نوا ساز محبت میں نہیں

جوشِ بیان ملاحظہ ہو ؎

ہنہن ہستیٔ خوابیدہ مری جاگ اٹھی
ہر بُنِ مو سے مرے اس نے پکارا مجھ کو

سوز و گداز :-

وہی لب تا بیاں جائے وہی یہ خستگی سمجھے
کہ جس نے آب و گل میں شورشیں بھر دیں محبت کی

متاعِ زیست کیا ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
جسے سب درد کہتے ہیں اسے ہم دل سمجھتے ہیں

اسی کو دل اسی کو زندگیٔ دل سمجھتے ہیں
یہاں حاصل سے بڑھ کر سعیٔ بے حاصل سمجھتے ہیں

بلند ہمتی :-

میں نہ بادہ کش بھی بے نیازِ جام و ساغر بھی :: رگِ ہر تاک سے آتی ہے کھنچ کر میری قسمت کی
یہاں تو عمر گذری ہے اسی موجِ تلاطم میں :: وہ کوئی اور ہوں گے بسر ساحل دیکھنے والے
کبھی سنتے تھے ہم یہ زندگی ہے وہم و بے معنی :: مگر اب موت کو بھی خطرۂ باطل سمجھتے ہیں
یہ مجھ سے سن لے تو رازِ یہاں سلامتی خود ہے دشمنِ جاں :: کہا نسے ہر وہیں زندگی ہو کہ راہ جب کہ خطر نہیں ہے
میں کہتا ہوں فلک کو بھی عطا کر زندگی :: تو کمالِ زندگی کہتا ہے مر جانے میں ہے

ذیل کا شعر ایک طرح کا درسِ بصیرت ہے جسے قدرتاً خشک ہونا چاہیے تھا۔ مگر طرزِ بیان کی لطافت ملاحظہ ہو ؎

چمک دمک پہ مٹا ہوا ہے یہ باغباں تجھکو کیا ہوا ہے :: فریبِ شبنم میں مبتلا ہے چمن کی اب تک خبر نہیں ہے
یہ مناظر کچھ نہیں ہیں جب نظر ہے مستعار :: اپنی آنکھوں سے کسی دن بزمِ امکاں دیکھیے

رندانہ مضامین کے پردہ میں کتنی اعلیٰ و لطیف حقیقتوں کی طرف اشارہ

کیا گیا ہے ؂

رند خالی ہاتھ بیٹھے ہیں اُڑا کر جزو و کل
اب کچھ شیشے میں باقی ہے نہ پیمانے میں ہے

غرق ہیں سب علم و حکمت دین و ایماں دیکھئے
کس طرح اُٹھتا ہے اک ساغر سے طوفاں دیکھئے

میکدے میں زندگی ہے شورِ نوشا نوش سے
مٹ گئے ہوتے اگر ہم جام و مینا دیکھتے

حکیمانہ خیالات کو جن میں جذبات کی شدت و لطافت بھی ہو شعریت کے رنگین و پرکیف لباس میں پیش کرنا جناب صغر کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جسے تقریباً اُن کے ہر ناقد نے تسلیم کیا ہے ایک انگریزی ادیب نے بہترین شعر کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ صداقت ہو۔ مگر بہت ہی عجیب" اس نقطۂ نظر سے ان اشعار پر غور کرنے کی ضرورت ہے ؂

دعوئ دید غلط دعوئ عرفاں بھی غلط
کچھ تجلّی کے سوا چشمِ بصیرت میں نہیں

عرش تک لے تو گیا تھا ساتھ اپنے حسن کو
پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے

دیدۂ بے خوابِ انجم سینۂ صد چاکِ گل
حسن بھی ہے مبتلائے دردِ پنہاں دیکھئے

رسمِ فرسودہ نہیں شایانِ اربابِ نظر
اب کوئی منظر بلند از کفر و ایماں دیکھئے

بوئے گل بن کے کبھی نغمۂ رنگیں بن کے
ڈھونڈ لیتا ہے ترا حسنِ خود آرا مجھ کو

ذرہ ذرہ ہے یہاں کا رہروِ راہِ فنا
سامنے کی بات بھی جب کو خبر سمجھا تھا میں

کائنات دہر ہے سرشارِ اسرارِ حیات
ایک مستِ آگہی کو بے خبر سمجھا تھا میں

دید کیا نظارہ کیا اس کی تجلّی گاہ میں وہ بھی موجِ حسن تھی جسکو نظر سمجھا تھا میں

میرے نزدیک اعلیٰ درجہ کی شاعری کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ کسطرح کے لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ آجکل حیدر آباد جامعہ ملیہ دہلی لاہور اور علی گڑھ یونیورسٹی کا درجہ اعلیٰ اور سنجیدہ ادب کے لحاظ سے بہت ہی ممتاز ہے۔ حیدر آباد نے "جدید شاعری" میں جناب اصغر کا تذکرہ بہت ہی شاندار طریقے سے کیا ہے۔ جامعہ ملیہ دھلی نے اصغر کے ستّو شعروں کا انتخاب شائع کیا ہے۔ لاہور کے ادبی رسائل اُن کا کلام ممتاز حیثیت سے شائع کرتے ہیں۔ علامہ سر اقبال نے اپنی پرائیویٹ چٹھیوں میں اُن کے کلام کی تعریف کی ہے، اس میں "جدت و تاثیر" کے قائل ہیں۔ اور اُسے اُردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ فرمایا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے اُن کے کلام کو یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کیا ہے۔ بہر صورت اِن تمام مقامات سے کسی نہ کسی صورت میں اُن کی شاعری کا اعتراف کیا گیا ہے۔ سب سے آخری اور سب سے بڑا ثبوت ایک ایسی ہستی کا تاثر ہے جس کی جامعیت اور جس کے ادبی کمالات کا اعتراف صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی کیا جاتا ہے وہ ذات گرامی مولانا ابو الکلام آزاد کی ہے۔ غرض کہ اِس

اس اعتبار سے بھی حضرت اصغرؔ کا کلام ہمارے دور کا ایک اعلیٰ ترین شاہکار ہے اور اس کا مستحق ہے کہ آجکل کے بہترین دِل و دماغ اس سے لطف اندوز ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان اس کو پڑھ کر ایک اعلیٰ، ولپرجوش اور پاکیزہ زندگی حاصل کریں گے۔

تیج بہادر سپرو

تقریظ

از حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

احباب میری کوتاہ قلمی سے بے خبر نہیں ہیں خصوصاً تقریظ کے معاملہ میں۔ لیکن بعض تقاضے ایسے ہوتے ہیں جن کی تعمیل کرنی ہی پڑتی ہے ایسا ہی ایک تقاضا ان سطور کی نگارش کا باعث ہوا۔ یہ اگر صاحب کلام کا ہوتا تو میں حسب معمول معذرت کر دیتا۔ مگر خود کلام کا تقاضا ہے اور اس کے لئے میرے پاس کوئی معذرت نہیں۔

اُردو شاعری کی موجودہ صف طویل نہیں ہے، اور اگر معیار کی بلندی پوری طرح قائم رکھی جائے تو معدودے چند اصحاب ذوق سے شمار آگے نہیں بڑھتا۔ ان ہی اصحاب ذوق میں مولوی اصغر حسین صاحب اصغر بھی ہیں جن کے کلام کا پہلا حصہ "نشاطِ روح" اور دوسرا حصہ "سرودِ زندگی" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

کئی سال کی بات ہے انہوں نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ جو نشاطِ روح کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مجھے بھیجا تھا۔ اس وقت تک ان کا کلام میری نظر سے نہیں گذرا تھا۔ چونکہ وقت کی عام ادبی سرگرمیوں کی طرف سے

طبیعت مایوسی کی عادت ہو چکی ہے اس لئے قدرتی طور پر ذہن کسی غیر معمولی دلچسپی کیلئے مستعد نہ تھا میں نے بے دلی سے مجموعہ اُٹھایا اور چاہا کہ ورق گردانی کر کے رکھ دوں لیکن مجھے اس اعتراف میں تامل نہیں کہ جونہی دو چار شعر نظر سے گذرے میں چونک اُٹھا اور جوں جوں مطالعہ کرتا گیا میری تعجب انگیز مسرت بڑھتی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وقت کی عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں ہیں۔

میں وقت کی شاعری سے اس اندازِ کلام کا متوقع نہ تھا۔

کیا کہیئے جاں نوازیٔ پیکانِ یار کو
سیراب کر دیا دلِ منّت گزار کو
جوشِ شباب، نشّۂ صہبا، ہجومِ شوق
تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

صحنِ حرم نہیں ہے یہ کوئے بتاں نہیں
اب کچھ نہ پوچھیئے کہ کہاں ہوں کہاں نہیں
عادت ہوئی کہ چشمِ تحیّر کو ہے سکوت
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں
سارا حصولِ عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں
فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح
لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

یہ عشق نے دیکھا ہے یہ عقل سے پنہاں ہے
قطرہ میں سمندر ہے، ذرّہ میں بیاباں ہے
پھر گرمِ نوازش ہے ضو مہرِ درخشاں کی
پھر قطرۂ شبنم میں ہنگامۂ طوفاں ہے

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا، اپنا ہی گریباں ہے

آغوش میں ساحل کے کیا لطف سکوں اسکو
یہ جانِ ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

غم صاحبِ تمکیں ہے افسانۂ محفل میں
مجنوں کو یہی لیکن پیغامِ بیاباں ہے

بچ حسنِ تعین سے ظاہر ہو کہ باطن ہو
یہ قید نظر کی ہے، وہ فکر کا زنداں ہے

اک ایک نفس میں ہے صد مرگِ بلا مضمر
جینا ہے بہت مشکل، مرنا بہت آساں ہے

⁂

خستگی نے کر دیا اُس کو رگِ جاں سے قریب
جستجو ظالم کہے جاتی تھی "منزل دُور ہے"

آنکھ ہو جب محوِ حیرت تو نمایاں ہے وہی
فکر ہو جب کارفرما تو وہی مستور ہے

دیکھتا ہوں میں کہ ہے بحرِ حقیقت جوش پر
جو حباب اُٹھ اُٹھ کے مِلتا ہے سرِ منصور ہے

⁂

راز کی جستجو میں مرتا ہوں
اور میں خود ہوں ایک پردۂ راز

⁂

میں نے یہ مجموعہ بے دلی کے ساتھ اُٹھایا تھا۔ لیکن جب رکھا تو اس اعتراف کے ساتھ رکھا کہ اردو میں ایک شاعر موجود ہے جس کی موجودگی سے میں اس وقت تک بے خبر تھا۔

میری نگاہ نکتہ چینی میں کمی نہیں کرتی، میں معیار کی پستی پر کسی طرح اپنے آپ کو راضی نہیں کر سکتا۔ اہلِ فن کو مجھ سے خوش گمانی کی نہیں، بدگمانی

کی شکایت ہے۔ تاہم میں محسوس کرتا ہوں جس شاعر کے کلام میں حسب ذیل اشعار موجود ہوں اس کی شاعری کی وقعت بحث و اثبات کی محتاج نہیں ہو سکتی ہے

قہر ہے تھوڑی سی بھی غفلت طریقِ عشق میں ۔ آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں ۔ ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھدی

انتہا کیف کی اُفتادگی و پستی ہے
مجھ سے کہتا تھا یہی دُردِ تہِ جام ابھی

پہلے ہستی کی جستجو ہے ضرور
پھر جو گم ہو تو جستجو نہ کرے

نہ یہ شیشہ، نہ یہ ساغر، نہ یہ پیمانہ بنے
جانِ میخانہ، تری نرگسِ مستانہ بنے!

کار فرما ہے فقط حسن کا نیرنگِ کمال
چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے

رند جو ظرف اُٹھالیں وہی ساغر بنجائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں، وہی میخانہ بنے

یہ تو رُخ کے کرشمے تھے سرِ راہ گزر
ذرّے جو خاک سے اُٹھے وہ صنم خانہ بنے

رودادِ قفس سنتا ہوں اس طرح قفس میں ۔ جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

قیدِ قفس میں طاقتِ پرواز اب کہاں
رعشہ سا کچھ ضرور ابھی بال و پر میں ہے

تھا حاصلِ نظارہ فقط ایک تحیّر
جلوے کو کہے کون کہ اب گم ہے نظر بھی

حسرتِ ناکام مری، کام سے غافل نہیں
اک طریقِ جستجو یہ دردِ مہجوری بھی ہے
ہیں تو ان مہجوریوں پر بھی سراپا دیدہ ہوں
اس کے جلوے کی ادا اک شانِ مستوری بھی ہے
میری محرومی کے اندر سے دی اس نے صدا
قرب کی راہوں میں میری راہ اک دوری بھی ہے
قلب پر اب تک تڑپتی ہے شعاعِ برقِ طور
خون کے قطروں میں اب تک رقصِ منصوری بھی ہے

جس پہ میری جستجو نے ڈال رکھے تھے حجاب ؞ بیخودی نے اب اسے محسوس عریاں کر دیا

بہائے درد و الم درد و غم کی لذّت ہے ؞ وہ رنگِ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لیے

پردۂ دہر کچھ نہیں اک ادائے شوخ ہے ؞ خاک اُٹھا کے ڈال دی دیدۂ امتیاز میں

پاتا نہیں جو لذتِ آہِ سحر کو میں
پھر کیا کروں گا لے کے الٰہی اثر کو میں

نظامِ دہر کیا؟ بیتابیوں کے کچھ مظاہر ہیں — گدازِ عشق گویا روح ہے اجزائے عالم کی
شعاعِ مہر خود بیتاب ہے جذبِ محبت سے — حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

حل کر لیا مجاز و حقیقت کے راز کو — پائی ہے میں نے خواب میں تعبیر خواب کی

میں ہوں ازل سے گرمِ رو عرصۂ وجود — میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

اسرارِ حقیقت کو ایک ایک سے پوچھا ہے — ہر نغمۂ رنگیں سے ہر شاہدِ زیبا سے

خروشِ آرزو ہو نغمۂ خاموشِ اُلفت بن — یہ کیا اک شیوۂ فرسودۂ آہ و فغاں برسوں
نہ کی کچھ لذتِ افتادگی میں اعتنا میں نے — مجھے دیکھا کیا اُٹھ کر غبارِ کارواں برسوں

گم کر دیا ہے دید نے یوں سر بسر مجھے — ملتی ہے اب انھیں سے کچھ اپنی خبر مجھے
کیا دردِ ہجر اور یہ کیا لذتِ وصال — اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

شعورِ غم نہ ہو فکرِ مآل کار نہ ہو — قیامتیں بھی گزر جائیں ہوشیار نہ ہو

فریاد ترے میکش نالاں ہے نگہِ ساقی
تو صورتِ مستی ہے تو معنیِ میخانہ!

دوسرے مجموعے یعنی "سرودِ زندگی" کا بھی یہی عالم ہے اصحابِ ذوق تسلیم کریں گے کہ یہ اشعار معیار میں ڈھلے ہوئے اور نقد و نظر سے بے پرواہ ہیں۔

عالم پہ ہے اک سکوت بیتاب
یا عکس ہے مری خامشی کا
ہاں سینہ کا دل کی طرح کر چاک
دے مر کے ثبوت زندگی کا

تو بہت سمجھا تو کہ گزرا فریبِ رنگ و بو
یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے
گوشہ گوشہ عالم و حکمت کا ہے سب دیکھا ہوا
یہ غنیمت ہے درِ میخانہ اب تک باز ہے
عام ہے وہ جلوہ لیکن اپنا اپنا طرزِ دید
میری آنکھیں بند ہیں اور چشمِ انجم باز ہے

اے کہ کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں
میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں
بکھرا دیئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں
کیوں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں
اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

تیری ہزار برتری تیری ہزار مصلحت
میری ہر اک شکست میں میرے ہر اک قصور میں

بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا — کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو
سنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی — لگا رکھا ہے سینہ سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

برگِ گُل کے دامن پر رنگ بن کے جمنا کیا — اس فضائے گلشن میں موجۂ صبا ہو جا!
تو ہے جب پیام اس کا پھر پیام کیا تیرا — تو ہے جب صدا اُس کی آپ بے صدا ہو جا!
آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو — پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا!
قطرۂ تنک مایہ بحرِ بے کراں ہے تو — اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا!

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا
وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے — جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا

اس سے بڑھ کر کوئی بے راہ روی کیا ہوگی — گامِ پُرشوق کا منزل سے شناسا ہونا۔

یا تو خرد کو ہوش کو مستی و بیخودی سکھا — یا نہ کسی کو ساتھ لے اس کے حریمِ ناز میں
شورشِ عندلیب نے روحِ چمن میں پھونک دی — ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

بہت سمجھے ہوئے ہیں شیخ راہ و رسمِ منزل کو — یہاں منزل کو بھی ہم جادۂ منزل سمجھتے ہیں

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں ؛ کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

⁂

جلوۂ ذوقِ پرستش گرمیٔ حُسنِ نیاز ؛ ورنہ کچھ کعبہ میں رکھا ہے نہ بتخانے میں ہے
میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی ؛ تو کمالِ زندگی سمجھا ہے مر جانے میں ہے

⁂

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا ؛ وہ پابندِ قفس جو فطرۃً آزاد ہوتا ہے
یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری ؛ جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

⁂

یہ مجھ سے سُن لے تو راز پنہاں سلامتی خود دشمنِ جاں ہے ؛ کہاں سرِ رہ گزرِ زندگی ہو کہ راہ جب پُر خطر نہیں ہے

⁂

تڑپنا ہے نہ جلنا ہے نہ جل کر خاک ہونا ہے ؛ یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرتِ پروانہ برسوں سے

⁂

عکس کسی چیز کا آئینۂ حیرت میں نہیں ؛ تیری صورت میں ہے کیا جو مری صورت میں نہیں
ذرّے ذرّے میں کیا جوشِ ترنم پیدا ؛ خود مگر کوئی نوا سازِ محبت میں نہیں

⁂

میں نے سرسری نظر ڈالتے ہوئے بعض اشعار پر نشان کر دیا تھا
یہاں نقل کر دیئے گئے ہیں۔ ورنہ اربابِ نظر کیلئے اس سے بہت زیادہ

سرمایۂ ذوق موجود ہے۔

ان سطور کی نگارش سے مقصود انتقاد و تبصرہ نہیں ہے اس کے لئے اور لوگ موجود ہیں۔ مقصود یہ تھا کہ اپنا تاثر ظاہر کر دوں۔ محاسن کا حق ہے کہ ان کی شہادت دی جائے۔ میں نے اصغر صاحب کے کلام میں حسن و خوبی پائی۔ میرا فرض تھا۔ کہ اس کی شہادت دوں۔

ابوالکلام

کلکتہ۔ ۲۸ رجون ۱۹۳۴ء

اپنی اِبتدا ہو کر اپنی اِنتہا ہو جا
ترکِ مُدّعا کر دے عینِ مدّعا ہو جا
شانِ عبد پیدا کر مظہرِ خُدا ہو جا
اس کی راہ میں مٹ کر بے نیازِ خلقت بن
حُسن پر فِدا ہو کر حُسن کی ادا ہو جا
برگِ گُل کے دامن پر رنگ بن کے جمنا کیا
اِس فضائے گلشن میں موجۂ صبا ہو جا

تو ہے جب پیام اُس کا پھر پیام کیا تیرا
تو ہے جب صدا اُس کی آپ بے صدا ہو جا
آدمی نہیں سُنتا آدمی کی باتوں کو۔
پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا
سازِ دل کے پردوں کو خود وہ چھیڑتا ہو جب
جانِ مُضطرب بن کر تو بھی لب کُشا ہو جا
قطرۂ تنک مایہ بحرِ بیکراں ہے تو
اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا

سنہ ۱۹۲۵ء

شہودِ غیب ہوا غیب ہو گیا ہے شہود

اگرچہ ساغرِ گل ہے تمام تر بے بود
چھلک رہی ہے چمن میں مگر شراب وجود

جو لے اُڑا مجھے مستانہ وار ذوقِ سجود
بتوں کی صف سے اُٹھا نعرہ "انا المعبود"

کہاں خرد ہے کہاں ہے نظامِ کار اس کا
یہ پوچھتی ہے تری نرگسِ خمار آلود

یہی نگاہ جو چاہے وہ انقلاب کرے
لباسِ زہد کو جس نے کیا شراب آلود

شعاعِ مہر کی جولانیاں ہیں ذرّوں میں
حجابِ حسن ہے آئینہ دارِ حُسنِ وجود
اُٹھا کے عرش کو رکھا ہے فرش پر لاکر
شہودِ غیب ہوا غیب ہو گیا ہے شہود
مذاقِ سیرِ نظر کو کچھ اور وسعت دے
کہ ذرّے ذرّے میں ہے اک جہانِ نامشہود
نیازِ سجدہ کو شائستۂ عمل کر
جہانِ نے یوں تو بنائے ہزار ہا معبود

مئی سنہ ۱۹۲۳ء

کیا ہوں میں؟

تمام دفترِ حکمت اُلٹ گیا ہوں میں
مگر کھلا نہ ابھی تک کہاں ہوں کیا ہوں میں
کبھی سنا کہ حقیقت ہے میری لاہوتی
کہیں یہ ضد کہ ہیولائے ارتقا ہوں میں
نہ مجھ سے پوچھیے کیا جستجو میں لذت ہے
فضائے دہر میں تحلیل ہو گیا ہوں میں
ہٹا کے شیشہ و ساغر ہجومِ مستی میں
تمام عرصۂ عالم پہ چھا گیا ہوں میں

اُڑا ہُوں جب تو فلک پر لیا ہے دم جا کر
زمیں کو توڑ گیا ہوں جو رہ گیا ہُوں میں

رہی ہے خاک کے ذرّوں میں بھی چمک میری
کبھی کبھی تو ستاروں میں ملگیا ہُوں میں

کبھی خیال کہ ہے خواب عالمِ ہستی
ضمیر میں ابھی فطرت کے سو رہا ہوں میں

کچھ انتہا نہیں نیرنگِ زیست کی میرے
حیاتِ محض ہوں پروردۂ فنا ہُوں ہوں

حیات و موت بھی ادنیٰ سی اک کڑی میری
ازل سے لیکے ابد تک وہ سلسلا ہوں میں

کہاں ہے سامنے آ مشعلِ یقیں لیکر
فریب خوردۂ عقل گریزپا ہوں میں

نوائے راز کا سینے میں خون ہوتا ہے
ستم ہے لفظ پرستوں میں گھر گیا ہوں میں

سما گئے مری نظروں میں چھا گئے دل پر
خیال کرتا ہوں اُن کو کہ دیکھتا ہُوں میں

نہ کوئی نام ہے میرا نہ کوئی صورت ہے
کچھ اس طرح ہمہ تن دید ہو گیا ہوں میں

نہ کامیاب ہوا میں نہ رہ گیا محروم
بڑا غضب ہے کہ منزل پہ کھو گیا ہوں میں

جہاں ہے کہ نہیں جسم و جاں بھی ہیں کہ نہیں
وہ دیکھتا ہے مجھے اس کو دیکھتا ہوں میں

ترا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے
مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں؟

مارچ ۱۹۳۴ء

خطاب بہ مسلم

کہاں اے مسلم سرگشتہ تو محوِ تماشا ہے
جب اس آئینہ ہستی میں تیرا ہی سراپا ہے
ہجوم کفر بھی جنبش ہے تیری زلفِ برہم کی
فضائے حسن ایماں انعکاسِ روئے زیبا ہے
جہانِ آب و گل میں ہر شرارِ زندگی تجھ سے
تری ذاتِ گرامی ارتقا کا اک ہیولا ہے
تجھی سے اس جہاں میں ہے بنا آئینِ حکمت کی
کہ سب مے کی بدولت اصطلاحِ جام و مینا ہے

ضوابط دین کامل کے دیئے تیرے ہاتھوں میں
تجھی سے خلق کی تکمیل کا بھی کام لینا ہے
تجھی کو دیکھتا ہوں روحِ اقوام و مذاہب میں
یہ رازِ زندگی سُن لے کہ ہر قطرے میں دریا ہے
فرشتوں نے وہاں پر حرزِ جاں اُسکو بنایا ہے
فرازِ عرش پر تیرا ہی کچھ نقشِ کفِ پا ہے
جو ہو للّٰہیت تو دین بن جاتی ہے یہ دنیا
اگر اغراض ہوں تو دین بھی بدتر از دنیا ہے
فرائض کار ہے احساس عالم کے مذاہب میں
یہی عارف کا مقصد ہے یہی شارع کا ایماں ہے

دسمبر ۱۹۲۵ء

آج بھی کچھ کمی نہیں چشمکِ برقِ طور میں

مجھ پہ نگاہ ڈال دی اس نے ذرا سرور میں
صاف ڈبو دیا مجھے موجِ مئے طہور میں
حسن کرشمہ ساز کا بزم میں فیض عام ہے
جانِ بلا کشاں ابھی آج غرق ہے موجِ نور میں
اُس نے مجھے دکھا دیا ساغرِ مئے اُچھال کر
آج بھی کچھ کمی نہیں چشمکِ برقِ طور میں
خیرگیٔ نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں
اور بھی دور ہو گئے آکے تیرے حضور میں
تیری ہزار برتری تیری ہزار مصلحت
میری ہر اک شکست میں میرے ہر اک قصور میں

دسمبر سنہ ۱۹۲۵ء

کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

نمایاں کر دیا اُس نے بہارِ رُوئے خنداں کو
کہ دی نغمے کو مستی رنگ کچھ صبحِ گلستاں کو

ذرا تکلیفِ جنبش دے نگاہِ برق ساماں کو
جہاں میں منتشر کر دے مذاقِ سوزِ پنہاں کو

زرا رو کے ہوئے موجِ تبسم ہائے پنہاں کو
ابھی یہ لے اُڑیں گی بجلیاں تارِ رگِ جاں کو

قفس ہو دام ہو کوئی چھڑائے اب یہ ناممکن!
ازل کے دن کلیجے میں بٹھایا تھا گلستاں کو

بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا
کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو

تمنا ہے نکل کر سامنے بھی عشوہ فرما ہو
کوئی دیتا ہے جنبش پردۂ بے تابیٔ جاں کو

یہاں کچھ نخل پر بکھرے ہوئے اوراقِ رنگیں ہیں
مگر اک مُشتِ پر سے پوچھئے رازِ گلستاں کو

دکھائی صورتِ گل پر بہارِ شوخیٔ پنہاں
چھپایا معنیٔ گل میں کبھی حسنِ نمایاں کو

ہوئے جو ماجرے خلوت سرائے راز میں اُس کی
نہ کفر اب تک ہوا واقف خبر اُس کی نہ ایماں کو

سُنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینہ سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

نہیں دیوانہ ہوں اصغرؔ نہ مجھکو ذوقِ عریانی
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

دسمبر سنہ ۱۹۲۵ء

دے مر کے ثبوت زندگی کا

یہ راز ہے میری زندگی کا
پہنے ہوئے ہوں کفن خودی کا

پھر نشترِ غم سے چھیڑتے ہیں
اک طرز ہے یہ بھی دل دہی کا

پھر ڈھونڈ رہا ہوں بیخودی میں
کھویا ہوا لطفِ آگہی کا

او، لفظ و بیاں میں چھپنے والے
اب قصد ہے اور خامشی کا

مرنا تو ہے ابتدا کی اک بات
جینا ہے کمالِ منتہی کا

عالم پہ ہے اک سکونِ بیتاب
یا عکس ہے میری خامشی کا

ہاں سینہ گلوں کی طرح کر چاک
دے مر کے ثبوت زندگی کا

یاس اک جنونِ ہوشیاری
امید فریبِ زندگی کا

اپریل ۱۹۵۶ء

٭ عالم رواں دواں بہ تقاضائے عشق ہے

ذرّوں کا رقص مستیٔ صہبائے عشق ہے
عالم رواں دواں بہ تقاضائے عشق ہے
بیٹھا ہے ایک خاک نشیں محوِ بے خودی
کچھ حُسن سے غرض ہے نہ پروائے عشق ہے
ہیجان و اضطراب ہے، اُمیّدِ وصل ہے
رازِ حیات شورشِ بیجائے عشق ہے
ہر عشوۂ حجاب، طریقِ نمودِ حُسن ٭
ہر حرفِ شوق پردۂ اخفائے عشق ہے

اب خودیہاں تغافل و بیگانگی سی ہے
کچھ یہ بھی طرفہ کاریِ سودائے عشق ہے
جب یہ نہیں تو ختم ہیں رنگینیاں تمام
سازِ خودی میں جوشِ نواہائے عشق ہے
کس درجہ ایک خاک کے ذرّے میں ہے تپش
ارض و سما میں شورش و غوغائے عشق ہے

دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء

ساغر بکف گرے تو سنبھلنا نہ چاہیئے

شکوہ نہ چاہیئے کہ تقاضا نہ چاہیئے
جب جان پر بنی ہو تو کیا کیا نہ چاہیئے

ساقی تری نگاہ کو پہچانتا ہوں میں
مجھ سے فریب ساغر و مینا نہ چاہیئے

یہ آستانِ یار ہے صحنِ حرم نہیں
جب رکھ دیا ہے سر تو اٹھانا نہ چاہیئے

خود آپ اپنی آگ میں جلنے کا لطف ہے
اہلِ تپش کو آتش سینا نہ چاہیئے

کیا کم ہیں ذوقِ دید کی جلوہ طرازیاں
آنکھوں کو انتظارِ تماشا نہ چاہیئے
وہ بارگاہِ حُسن ادب کا مقام ہے
جز دردِ اشتیاق تقاضا نہ چاہیئے
تیغ ادا ہیں اس کے ہے اک رُوح تازگی
ہم کشتگانِ شوق کو مرنا نہ چاہیئے
ہستی کے آب و رنگ کی تعبیر کچھ تو ہو
مجھ کو فقط یہ خوابِ زلیخا نہ چاہیئے
اس کے سوا تو معنیٔ مجنوں بھی کچھ نہیں
ایسا بھی ربطِ صُورتِ لیلیٰ نہ چاہیئے
ٹھہرے اگر تو منزلِ مقصود پھر کہاں
ساغر بکف گرے تو سنبھلنا نہ چاہیئے
اک جلوہ خال و خط سے بھی آراستہ سہی
واماندگیٔ ذوقِ تماشا نہ چاہیئے

سب اہلِ دید بیخود و حیران مست ہیں
کوئی اگر نہیں ہے تو پروانہ چاہیئے
اصغرؔ صنم پرست سہی پھر کسی کو کیا
اہلِ حرم کو کاوشِ بیجانہ چاہیئے

نومبر ۱۹۲۹ء

اِک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

موجوں کا عکس ہے خطِ جامِ شراب میں
یاں خوں اُچھل رہا ہے رگِ ماہتاب میں
باقی نہ تاب ضبط رہی شیخ و شاب میں
اُن کی جھلک بھی تھی مری چشمِ پُر آب میں
کیوں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں۔
اِک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں
وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جسکو سکون سب
وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

اتنا ہوا دلیل تو دریا کی بن سکے
مانا کہ اور کچھ نہیں موج و حباب میں

اس دن بھی میری روح تھی محوِ نشاطِ دید
موسیٰ الجھ گئے تھے سوال و جواب میں

دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوسِ حسن ہے
جو اس سے بے خبر ہیں وہی ہیں عذاب میں

میں اضطرابِ شوق کہوں یا جمالِ دوست
اک برق ہے جو کوند رہی ہے نقاب میں۔

مئی ۱۹۲۶ء

بکھرا دئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

میخانۂ ازل میں جہانِ خراب ہیں
ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب ہیں

اس رُخ پہ ہے نظر کبھی جام شراب ہیں
آیا کہاں سے نورِ شبِ ماہتاب ہیں

اقلیمِ جاں ہیں ایک تلاطم مچا دیا
یوں دیکھئے تو کچھ نہیں تارِ رباب ہیں

اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں

وہ برق رنگ خرمنِ جاں کیلئے کہاں
مانا کہ بوئے گل تو ملے گی گلاب میں
میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں
بکھرا دیئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں
اب کون تشنگانِ حقیقت سے یہ کہے
ہے زندگی کا رازِ تلاشِ سراب میں
میں اس ادائے مست خرامی کو کیا کہوں
میری نظر تو غرق ہے موجِ شراب میں
اصغرؔ غزل میں چاہیئے وہ موجِ زندگی
جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

مئی ۱۹۲۶ء

تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

میں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی
جلوؤں کے ازدحام نے حیراں بنا دیا

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

کچھ شورشوں کی نذر ہوا خونِ عاشقاں
کچھ جم کے رہ گیا اسے حرماں بنا دیا

اے شیخ وہ لبیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیر عشق کی
جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا

کیا کیا قیود دہر میں ہیں اہلِ ہوش کے
ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا

اِک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن
آج اس کو حُسن و عشق کا ساماں بنا دیا

مجبوریٔ حیات میں رازِ حیات ہے
زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

وہ شورشیں نظامِ جہاں جنکے دم سے ہے
جب مختصر کیا اُنھیں انساں بنا دیا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

بلبل بہ آہ و نالہ و گل مستِ رنگ و بو
مجھ کو شہیدِ رسمِ گلستاں بنا دیا

کہتے ہیں اک فریبِ مسلسل ہے زندگی
اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا

عالم سے بے خبر بھی ہوں عالم میں بھی ہوں میں
ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

اس حسن کاروبار کو مستوں سے پوچھیے
جس کو فریبِ ہوش نے عصیاں بنا دیا

ستمبر ۱۹۲۶ء

برق بھی لرزتی ہے میرے آشیانے سے

خون آرزو افشا ہو کسی بہانے سے
رنگ کچھ ٹپکتا ہے حسن کے فسانے سے

رنج تنہا اسیروں کو بال و پر کے جانیسے
اُڑ چلے قفس لیکر بوئے گل کے آنیسے

اب جو کچھ گذرنا ہو جان پر گذر جائے
چھاڑ کے اُٹھے دامن اُسکے آستانے سے

اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو
خود کو آزما بیٹھے مجھ کو آزمانے سے

مسکرائے جاتا ہوں اشک بہتے جاتے ہیں
غم کا کام لیتا ہوں عیش کے ترانے سے

زخم آپ لیتا ہوں لذتیں اُٹھاتا ہوں
تجھ کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانے سے

روشنی ہو جگنو کی جیسے شبستاں میں
وہ نقاب کا عالم اس کے مسکرانے سے

کثرت مظاہر ہے دفترِ فنا آموز
نیند آئی جاتی ہے حسن کے فسانے سے

اک نگارِ محجوبی اشک خوں میں پنہاں ہے
حسن کی نمائش ہے عشق کے بہانے سے

بے خودی کا عالم ہے محوِ جبہہ سائی ہوں
اب نہ سر سے مطلب ہے اور نہ آستانے سے

اک ایک تنکے پر سو شکستگی طاری
برق بھی لرزتی ہے میرے آشیانے سے
زمزمہ طرازوں کی گرمیٔ نوا معلوم
موجِ برق اُٹھتی ہے میرے آشیانے سے
اِس فضائے تیرہ کو گرم کر منوّر کر
داغِ دل نہیں کھلتا دیکھنے دِکھانے سے

نومبر ۱۹۲۶ء

اِک مقام ہے جہاں شام نہیں سحر نہیں

جز دلِ حیرت آشنا اور کو یہ خبر نہیں
ایک مقام ہے جہاں شام نہیں سحر نہیں

محوِ ذوق دید بھی جلوہ رُحسنِ یار بھی
ایک شعاعِ نور ہے اب یہ نظر نظر نہیں

سرو بھی جوئے یار بھی لالہ و گُل بہار بھی
جس سے چمن چمن بنا ایک وہ مشتِ پر نہیں

اب وہ قیل و قال ہے اب وہ ذوق وحال ہے
میرا مقام ہے وہاں میرا جہاں گذر نہیں

اس کی نگاہِ مہر خود مجھ کو اُڑا کے لے چلی
شبنمِ خستہ حال کو حاجتِ بال و پر نہیں

فتنۂ دہر بھی بجا فتنۂ حشر بھی دُرست
لذّتِ غم کے واسطے جب کوئی فتنہ گر نہیں

مارچ سنہ ۱۹۲۷ء

جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب طرزِ نظر ہے

جینے کا نہ کچھ ہوش نہ مرنے کی خبر ہے
اے شعبدہ پرواز یہ کیا طرزِ نظر ہے

سینے میں یہاں دل ہے نہ پہلو میں جگر ہے
اب کون ہے جو تشنۂ پیکانِ نظر ہے

ہے تابشِ انوار سے عالم تہہ و بالا
جلوہ وہ ابھی تک تہہِ دامانِ نظر ہے

کچھ ملتے ہیں اب پختگیِ عشق کے آثار
نالوں میں رسائی ہے نہ آہوں میں اثر ہے

ذرّوں کو یہاں چین نہ اجرام فلک کو
یہ قافلہ بے تاب کہاں گرم سفر ہے

خاموش یہ حیرت کدۂ دہر ہے اصغرؔ
جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب طرزِ نظر ہے

جنوری سنہ ۱۹۲۸ء

حُسن پر حُسن تبسّم صُبحِ خندانِ بہار

ہے سراپا حُسن وہ رنگیں ادا جانِ بہار
حُسن پر حُسن تبسّم۔ صبحِ خندانُ بہار

ایک سی گلکاریاں ہیں ایک سی رنگیں بہار
لیکے دامنِ نظر سے تا بہ دامانِ بہار

ذرّہ ذرّہ پھر بنے گا اِک جہانِ رنگ و بُو
چپکے چپکے ہو رہا ہے عہد و پیمانِ بہار

سبزہ و گل لہلہاتے ہیں نمو کا زور ہے
موجِ رنگا رنگ ہے یا جوش طوفانِ بہار

یوں نہ اس دورِ خزاں کو بے حقیقت جانیے
پرورش پائی ہے اس نے زیرِ دامانِ بہار

پھول یہ ایک بھی دامنِ پاکباز میں

نالۂ دل خراش میں آہِ جگر گداز میں

کون ستم طراز ہے پردۂ سوز و ساز میں

چاہیئے داغِ معصیت اس کے حریم ناز میں

پھول یہ ایک بھی نہیں دامنِ پاکباز میں

یا تو خرد کو ہوش کو مستی و بیخودی سکھا

یا نہ کسی کو ساتھ لے اُسکے حریم ناز میں

حشر میں اہل حشر سے دیکھئے خوش ادائیاں

فردِ عمل تو چاہیئے دستِ کرشمہ ساز میں

اب وہ عدم عدم نہیں پرتو حسنِ یار سے
باغ و بہار بن گیا آئینہ دستِ ناز ہیں

گم ہے حقیقت آشنا بندۂ دہر بے خبر
ہوش کسی کو بھی نہیں مے کدۂ مجاز ہیں

موج نسیم صبح ہیں بوئے صنم کدہ بھی ہے
اور بھی جان پڑ گئی کیفیت نماز ہیں

شورشِ عندلیب نے روح چمن ہیں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز ہیں

اصغرِ خاکسار وہ ذرّۂ خود شناس ہے
حشر سا کر دیا بپا جس نے جہانِ راز ہیں

نومبر ۱۹۲۸ء

تم نے جہاں بدل دیا آ کے مری نگاہ میں

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب کوئی نگاہ ہے
محو کھڑا ہوا ہوں میں حُسن کی جلوہ گاہ میں

اے تو بہارِ رنگ رنگ وائے ورائے آب و رنگ
عشق کسی نگاہ میں، حُسن کسی نگاہ میں

حُسن ہزار طرز کا ایک جہاں اسیر ہے
ملحد با خبر بھی گم جلوۂ لا الٰہ میں!

در پہ جو تیرے آ گیا اب کہیں مجھے اُٹھا
گردشِ مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں

اب وہ زماں نہ وہ مکاں اب وہ زمیں نہ آسماں
تم نے جہاں بدل دیا آ کے مری نگاہ میں

رازِ فتادگی نہ پوچھ لذّتِ خستگی نہ پوچھ
ورنہ ہزار جبرئیلؑ چھپ گئے گردِ راہ میں

لفظ نہیں بیاں نہیں یہ کوئی داستاں نہیں
شرحِ نیاز و عاشقی ختم ہے ایک آہ میں

ستمبر سنہ ۱۹۲۹ء

میری آنکھیں بند ہیں اور چشمِ انجم باز ہے

پردۂ فطرت میں میرے اک نوائے راز ہے

ذرّہ ذرّہ اس جہاں کا گوش بر آواز ہے

وہ سراپا حُسن ہے یا نغمۂ بے ساز ہے

چشمِ حیرت ہے کہ اک فریادِ بے آواز ہے

تو بہت سمجھا تو کہ گُذرا فریبِ رنگ و بُو

یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے

گوشہ گوشہ علم و حکمت کا ہے سب دیکھا ہوا

یہ غنیمت ہے درِ میخانہ اب تک باز ہے

کیف و مستی کی حقیقت ایک مینائے تہی
نغمہ بھی اس بزم میں ٹوٹا ہوا اِک ساز ہے

کیا گذرتی ہے شبِ غم تم اسی سے پوچھ لو
ایک پیاری شکل میری محرم و ہمراز ہے

بندشوں سے اور بھی ذوقِ رہائی بڑھ گیا
اب قفس بھی ہم اسیروں کو پرِ پرواز ہے

ہے خرد کی عشق کی دونوں کی ہستی پر نظر
یہ شہیدِ نغمہ ہے وہ مبتلائے ساز ہے

ہوش باقی ہوں تو اس پر کاوش بیجا بھی ہو
کیا خبر مجھ کو کہ یہ آواز ہے یا ساز ہے

کیا تماشا ہے کہ سب ہیں اور پھر کوئی نہیں
اس کی بزمِ ناز بھی خلوت سرائے راز ہے

سننے والا گوشِ بلبل کے سوا کوئی نہیں

ریشہ ریشہ ان گلوں کا اک صدائے راز ہے

عام ہے وہ جلوہ لیکن اپنا اپنا طرزِ دید

میری آنکھیں بند ہیں اور چشمِ انجم راز ہے

ختم کر اصغرؔ یہ آشفتہ نوائی ختم کر

کون سنتا ہے اسے یہ درد کی آواز ہے

اکتوبر ـــــــ ۱۹۲۹ء

مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

سینکڑوں رنگ کا سو رنگ سے رسوا ہونا
کبھی میکش کبھی ساقی کبھی مینا ہونا

از ازل تا بہ ابد محوِ تماشا ہونا
میں وہ ہوں جس کو نہ مرنا ہے نہ پیدا ہونا

سارے عالم میں ہے بیتابی و شورش برپا
ہائے اس شوخ کا ہم شکلِ تمنا ہونا

فصلِ گل کیا ہے؟ یہ معراج ہے آب و گل کی
میری رگ رگ کو مبارک رگِ سودا ہونا

کہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

جلوۂ حُسن کو ہے چشمِ تحیّر کی طلب
کس کی قسمت میں ہے محرومِ تماشا ہونا

دہر ہی سے وہ نمایاں بھی ہے پنہاں بھی ہے
جیسے صہبا کے لئے پردۂ مینا ہونا

تیری شوخی تری نیرنگ ادائی کے نثار
اک نئی جان ہے تجدیدِ تمنّا ہونا

حُسن کے ساتھ ہے بیگانہ نگاہی کا مزہ
قہر ہے قہر مگر عرضِ تمنّا ہونا

اس سے بڑھ کر کوئی بے راہ روی کیا ہوگی
گامِ پُرشوق کا منزل سے شناسا ہونا

مائلِ شعر و غزل پھر ہے طبیعت اصغرؔ
ابھی کچھ اور مقدّر میں ہے رسوا ہونا

ستمبر ۱۹۲۹ء

رنگ کو شعلہ بنا کر کون پروانے میں ہے

ایک ایسی بھی تجلّی آج میخانے میں ہے
لطف پینے میں نہیں ہے بلکہ کھو جانے میں ہے

معنیٔ آدم کجا و صورتِ آدم کجا
یہ نہاں خانے میں تھا، اب تک نہاں خانے میں ہے

خرمنِ بُلبل تو پھُونکا عشقِ آتش رنگ نے
رنگ کو شعلہ بنا کر کون پروانے میں ہے

جلوہ حُسنِ پرستش گریٔ حسنِ نیاز
ورنہ کچھ کعبے میں رکھا ہے نہ بتخانے میں ہے

رند خالی ہاتھ بیٹھے ہیں اُڑا کر جزو و کل
اب نہ کچھ شیشے میں ہے باقی نہ پیمانے میں ہے

میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی
تُو کہاں زندگی کہتا ہے مر جانے میں ہے

جس پہ بت خانہ تصدق جس پہ کعبہ بھی نثار
ایک صورت ایسی بھی سنتے ہیں بتّخانے میں ہے

کیا بہارِ نقشِ پا ہے اے نیازِ عاشقی!
لطف سر رکھنے میں کیا سر رکھ کے مر جانے میں ہے

بے خودی میں دیکھتا ہوں بے نیازی کی ادا
کیا فنائے عاشقی خود حُسن بن جانے میں ہے

نومبر ——— ۱۹۲۹ء

ہمہ تن دیدہ نہیں تجھ کو سراپا دیکھیں

دیکھنے والے فروغِ رُخِ زیبا دیکھیں
پردۂ حُسن پہ خود حُسن کا پردا دیکھیں

اشکِ پیہم کو سمجھ لیتے ہیں اربابِ نظر
حسن تیرا مرے چہرے سے جھلکتا دیکھیں

ہے تقاضا ترے جلوے کی فراوانی کا
ہمہ تن دیدہ نہیں تجھ کو سراپا دیکھیں

ساقیا جام بکف پھر ہو ذرا گرمِ نوا
حُسنِ یوسفؑ دمِ عیسیٰ یدِ بیضا دیکھیں

حسنِ ساقی کا تو مستوں کو ذرا ہوش نہیں
کچھ جھلک اس کی سرِ پردۂ مینا دیکھیں

نومبر ۱۹۲۹ء

رخِ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

یہ رنگِ عاشقی ہے سود و حاصل دیکھنے والے
یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

خطِ ساغر میں رازِ حق و باطل دیکھنے والے
ابھی کچھ لوگ ہیں ساقی کی محفل دیکھنے والے

مزے آ گئے ہیں عشوہ ہائے حسنِ رنگیں کے
تڑپتے ہیں ابھی تک رقصِ بسمل دیکھنے والے

یہاں تو عمر گذری ہے اسی موج و تلاطم میں
وہ کوئی اور ہونگے سیرِ ساحل دیکھنے والے

مرے نغموں سے صہبائے کہن بھی ہو گئی پانی
تعجب کر رہے ہیں رنگِ محفل دیکھنے والے

جنونِ عشق میں ہستی عالم پر نظر کیسی
رُخِ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

نومبر ــــــ ۱۹۲۹ء

مقام اپنا سمجھتے ہیں نہ ہم منزل سمجھتے ہیں

متاعِ زیست کیا ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
جسے سب درد کہتے ہیں اُسے ہم دل سمجھتے ہیں

اسی سے دل اسی سے زندگیٔ دِل سمجھتے ہیں
مگر حاصل سے بڑھ کر سعیٔ بے حاصل سمجھتے ہیں

کبھی سُنتے تھے ہم یہ زندگی ہے وہم و بے معنیٰ
مگر اب موت کو بھی خطرۂ باطل سمجھتے ہیں

بہت سمجھے ہوئے ہے شیخ راہ و رسمِ منزل کو
یہاں منزل کو بھی ہم جادۂ منزل سمجھتے ہیں

ابھرنا ہو جہاں، جی چاہتا ہے ڈوب مرنے کو
جہاں اُٹھتی ہوں موجیں ہم وہاں ساحل سمجھتے ہیں

کوئی سرگشتۂ راہِ طریقت اِس کو کیا جانے
یہاں افتادگی کو حاصلِ منزل سمجھتے ہیں

تماشا ہے نیاز و ناز کی باہم کشاکش کا
میں اُن کا دل سمجھتا ہوں وہ میرا دل سمجھتے ہیں

عبث ہے دعوئ عشق و محبت خامکاروں کو
یہ غم دیتے ہیں جس کو جوہرِ قابل سمجھتے ہیں

غمِ لا انتہا سعئ مسلسل شوقِ بے پایاں
مقام اپنا سمجھتے ہیں نہ ہم منزل سمجھتے ہیں

دسمبر ۱۹۲۹ء

کعبہ و بت خانہ ہیں دونوں خدا کے سامنے

رازکہئے یہ کسی اہلِ وفا کے سامنے
آشنا گم ہو گیا اک آشنا کے سامنے

وہ ازل سے تا ابد ہنگامۂ محشر بپا
میں اِدھر خاموش اک آفت ادا کے سامنے

دیکھئے اٹھتا ہے کب کوئی یہاں سے اہلِ درد
کعبہ و بت خانہ ہیں دونوں خدا کے سامنے

کامیابِ شوق کی ناکامیوں کو دیکھئے
حرفِ مطلب محو ہے جوشِ دعا کے سامنے

اب مجھے خود بھی نہیں ہوتا ہے کوئی امتیاز
مٹ گیا ہوں اس طرح اُس نقشِ پا کے سامنے

کائناتِ دہر کیا روح الامیں بیہوش تھے
زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

حشر ہے زاہد یہاں ہر چیز کا ہے فیصلہ
لا کوئی حُسنِ عمل میری خطا کے سامنے

رشکِ صد ایماں ہے اصغرؔ میرا طرزِ کافری
میں خدا کے سامنے ہوں بت خدا کے سامنے

اپریل ــــــــــ ۱۹۳۰ء

ابھی تک شاخِ گل کی شعلہ افشانی نہیں جاتی

ستم کے بعد اب ان کی پشیمانی نہیں جاتی
نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

پتہ ملتا نہیں اب آتشِ وادیٔ ایمن کا
مگر میخانۂ مے کی نور افشانی نہیں جاتی

مگر اِک مشتِ پر کی خاک سے کچھ ربط باقی ہے
ابھی تک شاخِ گل کی شعلہ افشانی نہیں جاتی

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو
مگر موجِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

اُڑا دیتا ہُوں اب بھی تارِ تارِ ہست و بود اصغرؔ
لباسِ زہد و تمکیں پر بھی عُریانی نہیں جاتی

اکتوبر ـــــــــــ سنہ ۱۹۳۰ء

کچھ فتنے اُٹھے حسن سے کچھ حسنِ نظر سے

جلوہ ترا اب تک ہے نہاں چشمِ بشر سے
ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

یہ عارضِ پُرنور پہ زلفیں ہیں پریشاں
کمبخت نکل گر ہی شام و سحر سے

مے دافعِ آلام ہے تریاق ہے لیکن
کچھ اور ہی ہو جاتی ہے ساقی کی نظر سے

وہ شوخ بھی معذور ہے مجبور ہوں میں بھی
کچھ فتنے اُٹھے حسن سے کچھ حسنِ نظر سے

اِس عالمِ ہستی میں نہ مرنا ہے نہ جینا
تُو نے کبھی دیکھا نہیں مستوں کی نظر سے
جانبازوں کے سینے میں ابھی اور بھی دل ہیں
پھر دیکھیے اک بار محبّت کی نظر سے
نظّارۂ پُرشوق کا اک نام ہے جینا
مرنا اِسے کہیے کہ گذرتے ہیں اِدھر سے

نومبر ـــــــــ ۱۹۳۰ء

رگِ ہر تاک سے آتی ہے کھنچ کر میری قسمت کی

ذرا سی آس ملنا چاہئے دردِ محبت کی
کہ خود بے چین ہے ذوقِ نوا سے بزمِ فطرت کی

نقابِ رُخ الٹ کر آج کیوں گرمِ تبسّم ہو
شعاعیں مجھ پہ کیوں پڑتی ہیں خورشیدِ قیامت کی

جہاں کی خیر ہو جانِ حزیں کی خیر ہو یارب
کہ لَو اونچی ہوئی جاتی ہے اب سوزِ محبّت کی

ہیں رندِ بادہ کش بھی بے نیازِ جام و ساغر بھی
رگِ ہر تاک سے آتی ہے کھنچ کر میری قسمت کی

وہی بے تابیاں جانے وہی یہ خستگی سمجھے
کہ جس نے آب و گل میں شورشیں بھر دیں محبّت کی

جہانِ گوہرِ مقصود ابھی گہرائیوں میں ہے
نظر پہنچے گی کیا افتادہ گردابِ حیرت کی
ترے نغمے کی لَے اے مطربِ آفت نوا کیا ہے
یہ موجِ برق ہے یا اک چمک دردِ محبّت کی
اُٹھا رکھا ہے اُس نے اپنے جلوے کو قیامت پر
قیامت ہے وہ جلوہ اُس کو کیا حاجت قیامت کی
تکلّم ہے ترا یا شعلہ وادیٔ ایمن ہے
تبسّم زیرِ لب ہے یا کلی کھلتی ہے جنّت کی
یہ بن کر برق و باراں دیکھیے کیا کیا غضب ڈھائے
خمِ گردوں سے موجِ مَے اٹھی ہے کس قیامت کی
طبیعت خود بخود آمادۂ وحشت تھی اے اصغؔر
ہوائے فصلِ گُل نے اور بھی اُس پر قیامت کی

جہاں میں چشمِ مہ و مہر باز رہنے دے

الٰہی خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے

زرا ہنوں کو بھی بندہ نواز رہنے دے

مجاز کا بھی حقیقت سے ساز رہنے دے

یہ راز ہے تو زرا حُسن راز رہنے دے

دِل حزیں میں شرارے دبے ہوئے ہیں ابھی

خدا کے واسطے اے نے نواز رہنے دے

صنم کدے میں تجلّی کی تاب مشکل ہے

حرم میں شیخ کو محوِ نماز رہنے دے

خبر کسی کو نہ ہو گی کنارِ شوق میں آ
جہاں میں چشمِ مہ و مہر باز رہنے دے
حیاتِ تازہ کی رنگینیاں نہ مِٹ جائیں
ابھی یہ مرحلۂ غم دراز رہنے دے
فسردہ دل ہُوں کہاں ہے وہ آتشیں نغمہ
کہ پردہ رہنے دے کوئی نہ ساز رہنے دے
حریمِ ناز کے آداب اور ہیں اصغرؔ
نیاز رکھ کے بھی عرضِ نیاز رہنے دے

اگست ـــــــــ ۱۹۳۱ء

یہ نظارہ ہے یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اُٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

قفس کیا، حلقہ ہائے دام کیا، رنجِ اسیری کیا
چمن پر مٹ گیا جو ہر طرح آزاد ہوتا ہے

یہ سب نا آشنائے لذّتِ پرواز ہیں شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیّاد ہوتا ہے

بہارِ سبزہ و گل ہے کرم ہوتا ہے ساقی کا
جواں ہوتی ہے دنیا میکدہ آباد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرۃً آزاد ہوتا ہے

بہارِ انجام سمجھوں اس چمن کا یا خزاں سمجھوں
زبانِ برگِ گُل سے مجھ کو کیا ارشاد ہوتا ہے

ازل میں اک تجلّی سے ہوئی تھی بیخودی طاری
تمہیں کو میں نے دیکھا تھا کچھ ایسا یاد ہوتا ہے

سمائے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدہ و دل میں
یہ نظّارہ ہے یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے

زمانہ ہے کہ خوگر ہو رہا ہے شورِ شیون کا
یہاں وہ درد جو بے نالہ و فریاد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیّاد ہوتا ہے

یہاں مستوں کے سر الزام ہستی ہی نہیں اصغرؔ
پھر اس کے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

فروری ـــــ ۱۹۳۲ء

کھلا ہے مجھ پر یہ راز ہستی کہ مجھ کو کچھ بھی خبر نہیں ہے

مجاز کیسا؟ کہاں حقیقت؟ ابھی تجھے کچھ خبر نہیں ہے

یہ سب ہے اک خواب کی سی حالت جو دیکھتا ہے سحر نہیں ہے

شمیمِ گلشن، نسیمِ صحرا، شعاعِ خورشید، موجِ دریا

ہر ایک گرمِ سفر ہے ان میں مگر کوئی ہم سفر نہیں ہے

نظر میں وہ گل سما گیا ہے تمام ہستی پہ چھا گیا ہے

چمن میں ہوں یا قفس میں ہوں میں مجھے اب اس کی خبر نہیں ہے

چمک دمک پر مٹا ہوا ہے یہ باغباں تجھ کیا ہُوا ہے

فریبِ شبنم میں مبتلا ہے چمن کی اب تک خبر نہیں ہے

یہ مجھ سے سن لے تُو رازِ پنہاں سلامتی خود ہے دشمنِ جاں
کہاں سے رہرو میں زندگی ہو کہ راہ جب پُرخطر نہیں ہے

میں سر سے پا تک ہوں مے پرستی تمام شورش تمام مستی
کُھلا ہے مجھ پر یہ رازِ ہستی کہ مجھ کو کچھ بھی خبر نہیں ہے

ہوا کو موجِ شراب کر دے فضا کو مست و خراب کر دے
یہ زندگی کو شباب کر دے نظر تمہاری نظر نہیں ہے

پڑا ہے کیا اس کے در پہ اصغرؔ وہ شوخ مائل ہے امتحاں پر
ثبوت دے زندگی کا مر کر نیاز اب کارگر نہیں ہے

مارچ ______ ۱۹۳۲ء

کون ذرّہ ہے کہ سرشارِ محبت میں نہیں

عکس کس چیز کا آئینۂ حیرت میں نہیں
تیری صورت میں ہے کیا جو مری صورت میں نہیں

دونوں عالم تری نیرنگ ادائی کے نثار
اب کوئی چیز یہاں جیبِ محبّت میں نہیں

دولتِ قرب کو خاصانِ محبّت جانیں
چند اشکوں کے سوا کچھ مری قسمت میں نہیں

لوگ مرتے بھی ہیں جیتے بھی ہیں بیتاب بھی ہیں
کون سا سحر تری چشمِ عنایت میں نہیں

سب سے اک طرز جدا سب سے اک آہنگ جدا
رنگ محفل میں ترا جو ہے وہ خلوت میں نہیں

نشۂ عشق میں ہر چیز اُڑی جاتی ہے
کون ذرّہ ہے کہ سرشارِ محبّت میں نہیں

دعویٰ دید غلط دعویٰ عرفاں بھی غلط
کچھ تجلّی کے سوا چشمِ بصیرت میں نہیں

ہو گئی جمع متاعِ غمِ حرماں کیونکر
میں سمجھتا تھا کوئی پردۂ غفلت میں نہیں

ذرّے ذرّے میں کیا جوشِ ترنم پیدا
خود مگر کوئی نواسازِ محبّت میں نہیں

نجد کی سمت سے یہ شورِ انا لیلےٰ کیوں
شوخیٔ حسن اگر پردۂ وحشت میں نہیں

مارچ ۱۹۲۲ء

اک لہو کی بوند کیوں ہنگامہ آرا دل میں ہے

عشق کی فطرت ازل سے حُسن کی منزل میں ہے
قیس بھی محمل میں ہے لیلیٰ اگر محمل میں ہے

جستجو ہے زندگی ، ذوقِ طلب ہے زندگی
زندگی کا راز لیکن دوریٔ منزل میں ہے

لالہ و گل تم نہیں ہو ماہ و انجم تم نہیں
رنگِ محفل بن کے لیکن کون اس محفل میں ہے

اس چمن میں آگ برسے گی کہ آئے گی بہار
اک لہُو کی بُوند کیوں ہنگامہ آرا دل میں ہے

اُٹھ رہی ہے مٹ رہی ہے موجِ دریائے وجُود
اور کچھ ذوقِ طلب میں ہے نہ کچھ منزل میں ہے

طُور پر لہرا کے جس نے پھونک ڈالا طور کو
اک شرارِ شوق بن کر میرے آب و گِل میں ہے

محوِ ہو کر رہ گئی جو، ہے وہی راہِ طریق
جو قدم مستانہ پڑتا ہے وہی منزل میں ہے

ہو کے رازِ عشق افشا بن گیا اک راز دار
سب زباں پر آچکا ہے سب ابھی تک دل میں ہے

عرش تک تو لے گیا تھا ساتھ اپنے حُسن کو
پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے

اصغرؔ افسردہ ہے محرومِ موجِ زندگی
تُو نوائے روح پرور بن کے کس محفل میں ہے

جون ۱۹۲۳ء

لُطف جب ہے اپنی دُنیا آپ پیدا کیجئے

حُسن بن کر خود کو عالم آشکارا کیجیے
پھر مجھے پردہ بنا کر مجھ سی پردا کیجیے

اضطرابِ غم سے ہے نشوونمائے زندگی
ہر نفس میں ایک تازہ درد پیدا کیجیے

کھل گیا رنگِ حسیناں کھل گیا رنگِ چمن
کم سے کم اتنا نظر میں حُسن پیدا کیجیے

عقل ہو غرقِ تجلّی رُوح پا جائے جِلا
بیٹھ کر اک لحظہ شغلِ جام و مینا کیجیے

اک دلِ بیتاب ہیں پہلو میں پھر پیدا کروں
مُسکرا کر پھر ذرا مجھ سے تقاضا کیجیے

پرورش پاتا ہے رگ رگ میں مذاقِ عاشقی
جلوہ پھر دکھلائیے پھر مجھ سے پردا کیجیے

اس جہانِ غیر میں آرام کیا راحت کہاں
لطف جب ہے اپنی دنیا آپ پیدا کیجیے

دیر سی بھولے ہوئے ہیں رسمِ مستی اہلِ بزم
آج ہر موجِ نفس کو موجِ صہبا کیجیے

رندِ ادھر بیخود اُدھر دیر و حرم گرمِ طواف
عرش بھی اب جھوم کر آتا ہے دیکھا کیجیے

دیکھتا ہوں میں کہ انساں گم ہی رہا ہے وجود
خود حباب و موج بن کر اب تماشا کیجیے

حُسن کی بیگانگی و بے نیازی سب بجا
اس پہ چھپ کر پردۂ گل سے اشارا کیجیے

ایک ہی ساغر میں اصغرؔ کھل گئی دل کی گرہ
رازِ ہستی بھی کھلا جاتا ہے دیکھا کیجیے

جولائی ——— ۱۹۳۲ء

کہاں کھوئی ہوئی ہے جراتِ رندانہ برسوں سے

خدا جانے کہاں ہے اصغرِ دیوانہ برسوں سے
کہ اس کو ڈھونڈتے ہیں کعبہ و بُت خانہ برسوں سے

تڑپنا ہے نہ جلنا ہے نہ جل کر خاک ہونا ہے
یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرتِ پروانہ برسوں سے

کوئی ایسا نہیں یارب کہ جو اس درد کو سمجھے
نہیں معلوم کیوں خاموش ہے دیوانہ برسوں سے

کبھی سوزِ تجلی سے اُسے نسبت نہ تھی گویا
پڑی ہے اس طرح خاکسترِ پروانہ برسوں سے

ترے قربان ساقی اب وہ موجِ زندگی کیسی
نہیں دیکھی ادائے لغزشِ مستانہ برسوں سے

مری رندی عجب رندی مری مستی عجب مستی
کہ سب ٹوٹے پڑے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے

حسینوں پر نہ رنگ آیا نہ پھولوں میں بہار آئی
نہیں آیا جو لب پر نغمۂ مستانہ برسوں سے

کھلی آنکھوں سے ہوں حسنِ حقیقت دیکھنے والا
ہوئی لیکن نہ توفیقِ درِ بتخانہ برسوں سے

لباسِ زہد ہو پھر کاش نذرِ آتشِ صہبا
کہاں کھوئی ہوئی ہے جرأتِ رندانہ برسوں سے

جسے لینا ہو آکر اُس سے اب درسِ جنوں لے لے
سنا ہے ہوش میں ہے اصغرِ دیوانہ برسوں سے

میں کہاں ہوں کہ اٹھائے گی قیامت مجھ کو

دے مسرت مجھے اور عینِ مسرت مجھ کو
چاہیے غم بھی باندازۂ راحت مجھ کو

جانِ مشتاق مری موجِ حوادث کے نثار
حسن نے ہر لحظہ دیا درسِ محبت مجھ کو

خود میں اُٹھ جاؤں کہ یہ پردۂ ہستی اُٹھ جائے
دیکھنا ہے کسی عنواں تری صورت مجھ کو

دلِ بیتاب میں ہنگامۂ محشر ہے بپا
مار ڈالے نہ تری چشمِ عنایت مجھ کو

آگئی سامنے اک جلوۂ رنگیں کی بہار
عشق نے آج دکھا دی مری صورت مجھ کو

نگہِ ناز کو یہ بھی تو گوارا نہ ہوا
اک ذرا درد میں ملتی تھی جو راحت مجھ کو

آج ہی محو ہے خورشید میں ذرّہ ذرّہ
میں کہاں ہوں کہ اُٹھائے گی قیامت مجھ کو

ستمبر ۱۹۳۲ء

ہم اہلِ راز سب رنگینیِ مینا سمجھتے ہیں

نمودِ حسن کو حیرت ہیں ہم کیا کیا سمجھتے ہیں
کبھی جلوہ سمجھتے ہیں کبھی پردا سمجھتے ہیں

ہم اس کو دیں اسی کو حاصلِ دنیا سمجھتے ہیں
مگر خود عشق کو اس سے بھی بے پروا سمجھتے ہیں

کبھی ہیں محوِ دید ایسے سمجھ باقی نہیں رہتی
کبھی دیدار سے محروم ہیں اتنا سمجھتے ہیں

یکایک توڑ ڈالا ساغرِ مے ہاتھ میں لے کر
مگر ہم بھی مزاجِ نرگسِ رعنا سمجھتے ہیں

کبھی گُل کر کے پردہ ڈال دیتے ہیں ہم اُس رخ پر
کبھی مستی میں پھر گُل کو رُخِ زیبا سمجھتے ہیں

یہاں تو ایک پیغامِ جنوں پہنچا ہے مستوں کو
اب ان سے پُوچھئے دُنیا کو جو دُنیا سمجھتے ہیں

یہی تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا پیمانہ
اسی سے رند رازِ گنبدِ مینا سمجھتے ہیں

کبھی تو جستجو جلوے کو بھی پردہ بتاتی ہے
کبھی ہم شوق میں پردے کو بھی جلوا سمجھتے ہیں

خوشا وہ دن کہ حُسنِ یار سے جب عقل خیرہ تھی
یہ سب محرومیاں ہیں آج ہم جتنا سمجھتے ہیں

کبھی جوشِ جنوں ایسا کہ چھا جاتے ہیں صحرا پر
کبھی ذرّے میں گم ہو کر اُسے صحرا سمجھتے ہیں

یہ ذوقِ دید کی شوخی وہ عکسِ رنگِ محبوبی
نہ جلوہ ہے نہ پردہ ہم اسے تنہا سمجھتے ہیں
نظر بھی آشنا ہو نشۂ بے نقش و صورت سے
ہم اہلِ راز سب رنگینیٔ مینا سمجھتے ہیں
وہ نکہت سے سوا پنہاں وہ گُل سے بھی سوا عُریاں
یہ ہم ہیں جو کبھی پردہ کبھی جلوا سمجھتے ہیں
یہ جلوے کی فراوانی یہ ارزانی یہ عُریانی
پھر اس شدّت کی تابانی کہ ہم پردا سمجھتے ہیں
دِکھا جلوہ وہی غارت کُنِ جانِ حزیں جلوہ
ترے جلوے کے آگے جان کو ہم کیا سمجھتے ہیں
زمانہ آرہا ہے جب اسے سمجھیں گے سب اصغرؔ
ابھی تو آپ خود کہتے ہیں خود تنہا سمجھتے ہیں

دسمبر ——— ۱۹۳۲ء

یہ میخانہ ہے اس میں معصیت ہے باخبر ہونا

وہ ان کا اک بہارِ ناز بن کر جلوہ گر ہونا
مرا وہ رُوح بننا، روح بن کر اک نظر ہونا

یہ آنا جلوہ بن کر اور پھر میری نظر ہونا
یہی ہے دید تو خود دید بھی اے فتنہ گر ہونا

حجاب اس کا ظہور ایسا ظہور اس کا حجاب ایسا
ستم ہے خواب میں خورشید کا یوں جلوہ گر ہونا

عجب اعجازِ فطرت ہی اسیروں کو بھی حیرت ہے
وہ موجِ بوئے گل کا خود تڑپ کر بال و پر ہونا

جمالِ یار کی زینت بڑھا دی رنگ و صورت سے
قیامت ہے قیامت میرا پابندِ نظر ہونا

ابھی یہ طرزِ مستی مجھ سے سیکھیں میکدے والے
نظر کو چند موجوں پر جما کر بے خبر ہونا

یہاں میں ہوں نہ ساقی ہی نہ ساغر ہی نہ صہبا ہے
یہ میخانہ ہے اس میں معصیت ہے باخبر ہونا

طلسمِ رنگ و بُو کو جس نے سمجھا مٹ گیا اصغرؔ
نظر کے لطف کا برباد ہونا ہے نظر ہونا

دسمبر ۱۹۳۲ء

ماہ و انجم کو تو سرگرمِ سفر سمجھا تھا میں

ذرّے ذرّے میں اسی کو جلوہ گر سمجھا تھا میں
عکس کو حیرت میں آئینہ مگر سمجھا تھا میں

دید کیا نظّارہ کیا اس کی تجلّی گاہ میں
وہ بھی موجِ حسن تھی جس کو نظر سمجھا تھا میں

پھر وہی واماندگی ہے پھر وہی بیچارگی
ایک موجِ بُوئے گل کو بال و پر سمجھا تھا میں

یہ تو شب کو سربسجدہ ساکت و مدہوش تھے
ماہ و انجم کو تو سرگرمِ سفر سمجھا تھا میں

دہر ہی نے مجھ پہ کھولی راہِ بے پایانِ عشق
راہبر کو اک فریبِ رہ گذر سمجھا تھا میں

کتنی پیاری شکل اس پردے میں ہے جلوہ فروز
عشق کو ژولیدہ مُو آشفتہ سر سمجھا تھا میں

تا طلُوعِ جلوۂ خورشید پھر آنکھیں ہیں بند
تجھ کو اے موجِ فنا نورِ سحر سمجھا تھا میں

مست و بے خود ہیں مہ و انجم زمین و آسماں
یہ تری محفل تھی جس کو رہ گذر سمجھا تھا میں

ذرّہ ذرّہ ہے یہاں کا رہروِ راہِ فنا
سامنے کی بات تھی جس کو خبر سمجھا تھا میں

پتّے پتّے پر چمن کے ہے وہی چھائی ہوئی
عندلیبِ زار کو اک نشترِ پر سمجھا تھا میں

کائناتِ دہر ہے سرشارِ اسرارِ حیات
ایک مستِ آگہی کو بے خبر سمجھا تھا میں

جان ہے محوِ تجلی چشم و گوش و لب ہیں بند
حسن کو حسنِ بیاں حسنِ نظر سمجھا تھا میں

میں تو کچھ لایا نہیں **اصغرؔ** بجز بے مائگی
سر کو بھی اس آستاں پر دردِ سر سمجھا تھا میں

فروری ـــــــــــ ۱۹۳۳ء

مٹ گئے ہوتے اگر ہم جام و مینا دیکھتے

رقصِ مستی دیکھتے جوشِ تمنا دیکھتے
سامنے لا کر تجھے اپنا تماشا دیکھتے

کم سے کم حسنِ تخیّل کا تماشا دیکھتے
جلوۂ یُوسف تو کیا خوابِ زلیخا دیکھتے

کچھ سمجھ کر ہم نے رکھا ہے حجابِ دہر کو
توڑ کر شیشے کو پھر کیا رنگِ صہبا دیکھتے

روزِ روشن یا شبِ مہتاب یا صبحِ چمن
ہم جہاں سے چاہتے وہ روئے زیبا دیکھتے

قلب پر گرتی تڑپ کر پھر وہی برقِ جمال
ہر بُنِ مُو میں وہی آشوب و غوغا دیکھتے

صد زمان و صد مکان و این جہان و آن جہاں
تم نہ آجاتے تو ہم وحشت میں کیا کیا دیکھتے

اس طرح کچھ رنگ بھر جاتا نگاہِ شوق میں
جلوہ خود بیتاب ہو جاتا وہ پردا دیکھتے

جن کو اپنی شوخیوں پر آج اتنا ناز ہے
وہ کسی دن میری جانِ ناشکیبا دیکھتے

میکدے میں زندگی ہے شورِ نوشانوش سے
مِٹ گئے ہوتے اگر ہم جام و مینا دیکھتے

مارچ ۱۹۳۳ء

دعا تک بھول جاتے مُدّعا اتنا حسیں ہوتا

مذاقِ زندگی سے آشنا جب رخ بریں ہوتا
مہ و انجم سے بہتر ایک جامِ آتشیں ہوتا

ترے ہی در پہ مٹ جانا لکھا ہے میری قسمت میں
ازل میں یا ابد میں میں کہیں ہوتا یہیں ہوتا

وہ اٹھی موجِ مے وہ سینۂ مینا دھڑکتا ہے
اسی کا ایک جرعہ کس قدر جاں آفریں ہوتا

نگاہیں دیکھتی ہیں روح قالب میں تڑپتی ہے
مرا کیا حال ہوتا تو اگر پردہ نشیں ہوتا

طلب کیسی کہاں کا سود و حال کیفِ مستی میں
دُعا تک بھول جاتے مُدّعا اتنا حسیں ہوتا

خود اپنی ناز برداری سے اب فرصت نہیں دل کو
حسینوں کا تصور کیوں نہ اتنا نازنیں ہوتا

ابد تک تجھ سے رہتی داستاں شکر و شکایت کی
نہ کوئی ہم نفس ہوتا نہ کوئی ہم نشیں ہوتا

ترے قربان ساقی اب یہ کیا حالت ہے مستوں کی
کبھی عالم تو ہوتا ہے کبھی عالم نہیں ہوتا

صنم خانے میں کیا دیکھا کہ جا کر کھو گیا **اصغرؔ**
حرم میں کاش رہ جاتا تو ظالم شیخِ دیں ہوتا

جون ۱۹۳۳ء

کلی کی آنکھ کھُل جائے، چمن بیدار ہو جائے

وہ نغمۂ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھُل جائے، چمن بیدار ہو جائے

نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں سے پار ہو جائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے بیکار ہو جائے

تبسّم کی ادا سے زندگی بیدار ہو جائے
نظر سے چھیڑ دے رگ رگ مری ہشیار ہو جائے

تجلّی چہرۂ زیبا کی ہو کچھ جامِ رنگیں کی
زمیں سے آسماں تک عالمِ انوار ہو جائے

تم اس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو
جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خمدار ہو جائے

سحر لائے گی کیا پیغامِ بیداری شبستاں میں
نقابِ رُخ الٹ دو خود سحر بیدار ہو جائے

یہ اقرارِ خودی ہے دعوئ ایمان و دیں کیسا
ترا اقرار جب ہے خود سے بھی انکار ہو جائے

نظر اس حُسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے
کبھی خُود پھُول بن جائے کبھی رخسار ہو جائے

کچھ ایسا دیکھ کر چپ ہوں بہارِ عالمِ امکاں
کوئی اک جام پی کر جس طرح سرشار ہو جائے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے۔۔

نومبر ۱۹۳۳ء

مٹنے کو یوں مٹیں کہ ابد تک نشاں رہے

آشوبِ حسن کی بھی کوئی داستاں رہے
مٹنے کو یوں مٹیں کہ ابد تک نشاں رہے

طوفِ حرم میں یا سرِ کوئے بتاں رہے
اک برقِ اضطراب رہے ہم جہاں رہے

ان کی تجلّیوں کا بھی کوئی نشاں رہے
ہر ذرّہ میری خاک کا آتش بجاں رہے

کیا کیا ہیں دردِ عشق کی فتنہ طرازیاں
ہم التفاتِ خاص سے بھی بدگماں رہے

میرے سرشکِ خوں ہی سے رنگینیٔ حیات
یارب فضائے حسن ابد تک جواں رہے

میں رازدارِ حسن ہوں تم رازدارِ عشق
لیکن یہ امتیاز بھی کیوں درمیاں رہے

نومبر ـــــــ ۱۹۲۳ء

جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے

وہ سامنے ہیں، نظامِ حواس برہم ہے
نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے

زمیں سے تا بہ فلک کچھ عجیب عالم ہے
یہ جذبِ مہر ہے یا آبروئے شبنم ہے

بہارِ جلوۂ رنگیں کا اب یہ عالم ہے
نظر کے سامنے حسنِ نظر مجسّم ہے

نگاہِ عشق تو بے پردہ دیکھتی ہے اسے
خرد کے سامنے اب تک حجابِ عالم ہے

ردائے لالہ و گل پردۂ مہ و انجم
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے

نہ اب وہ گریۂ خونیں نہ اب وہ رنگِ حیات
نہ اب وہ زیست کی لذت کہ درد بھی کم ہے

خوشا حوادثِ پیہم خوشا یہ اشکِ رواں
جو غم کے ساتھ ہو تم بھی تو غم کا کیا غم ہے

اسے مجاز کہو یا اسے حجاب کہو
نگاہِ شوق پہ اک اضطراب پیہم ہے

اب کوئی منظر بلند از کفر و ایماں دیکھئے

تا بہ کے آخر ملالِ شامِ ہجراں دیکھئے
نالۂ نے کی طرح اُڑ کر نیستاں دیکھئے

غرق ہیں سب علم و حکمت دین و ایماں دیکھئے
کس طرح اٹھتا ہے اک ساغر سے طوفاں دیکھئے

بے محابا اب فروغِ روئے جاناں دیکھئے
فکرِ ایماں کیا نظر سے عینِ ایماں دیکھئے

یہ مناظر کچھ نہیں ہیچ جب نظر ہے مستعار
اپنی آنکھوں سے کسی دن بزمِ امکاں دیکھئے

جسم کو اپنا سا کر کے لے اُڑی افلاک پر
اللہ اللہ یہ کمالِ روحِ جولاں دیکھئے

اک تبسم، یا ترنم، اک نظر یا نیشتر
کچھ نہ کچھ ہوگا پھڑکتی ہے رگِ جاں دیکھئے

نالۂ رنگیں میں ہم مستوں کے ہے کیفِ شراب
لڑکھڑائے پائے نازک دیکھئے ہاں دیکھئے

دیدۂ بے خوابِ انجم سینۂ صد چاکِ گل
حسن بھی ہے مبتلائے دردِ پنہاں دیکھئے

یہ حسنِ دوست ہے اور التجائے جانبازی تجھے یہ وہم کہ یہ کائناتِ عالم ہے

یہ ذوقِ سیر، یہ دیدارِ جلوۂ خورشید برائے قطرۂ شبنم کی زندگی کم ہے

بس اک سکوت ہے طاری حرم نشینوں پر صنم کدے میں تجلی ہے اور پیہم ہے

نوائے شعلہ طراز و بہارِ حسنِ بتاں کوئی مٹے تو تری یہ ادا بھی کیا کم ہے

کسی طرح بھی تری یاد اب نہیں جاتی یہ کیا ہے نذرِ مسرت ہے یا شبِ غم ہے

کہاں زمان و مکاں پھر کہاں یہ ارض و سما یہاں تم آئے یہ ساری بلا بہم ہے

یہاں فسانۂ دیر و حرم نہیں اصغرؔ
یہ میکدہ ہے یہاں بیخودی کا عالم ہے

دسمبر ۱۹۳۳

رسمِ فرسودہ نہیں شایانِ اربابِ نظر — اب کوئی منظر بلند از کفر و ایماں دیکھئے

میں نہ کہتا تھا کہ آفت ہے شرابِ شعلہ رنگ — سوختہ آخر ہو گئے سب کفر و ایماں دیکھئے

دیدۂ بینا فروغِ بادہ و حسنِ بتاں — ہر طرف پھیلا ہوا ہے نورِ عرفاں دیکھئے

عشق کا ارشاد پہلو میں ہو بلبل کا جگر — عقل کہتی ہے رگِ گل میں گلستاں دیکھئے

تیز گامی سخت گوئی عشق کا فرمان ہے — علم کا اصرار ذرے میں بیاباں دیکھئے

موسمِ گل کیا ہے اک جوشِ شبابِ کائنات — چھوٹ نکلا شاخِ گل سے حسنِ عریاں دیکھئے

قالبِ بیجاں میں جاگ اٹھا شرارِ زندگی — دیکھئے بوئے قمیصِ ماہ کنعاں دیکھئے

اصغرِ رنگیں نوا کا یہ تغزل الاماں
کفر پھیلاتا ہے یہ مردِ مسلماں دیکھئے

فروری ۱۹۳۴ء

ہر بُنِ مُو سے مرے اُس نے پکارا مجھ کو

یہ جہانِ مہ و انجم ہے تماشا مجھ کو — دشتِ دنیا تھا بہ اندازۂ سودا مجھ کو

اب تو خود شاق ہے یہ ہستیِ بیجا مجھ کو — پھونک دے پھونک دے اے برقِ تماشا مجھ کو

میرا آئینۂ فطرت ہے عجب آئینہ — نظر آتا ہے ترا چہرۂ زیبا مجھ کو

تیرا جلوہ، ترا انداز، ترا ذوقِ نمود — اب یہ دُنیا نظر آتی نہیں دُنیا مجھ کو

اُف وہی شعلۂ بیتاب ہے رگ رگ میں مری — پھونکے دیتی تھی کبھی تابشِ مینا مجھ کو

ہمہ تن ہستیِ خوابیدہ مری جاگ اٹھی — ہر بُنِ مُو سے مرے اُس نے پکارا مجھ کو

اُف وہی چشمِ فسوں کار مجھے بھول گئی — کس محبت سے کیا تھا تہ و بالا مجھ کو

کون سی بزم سے آتے ہیں جوانانِ چمن — خاک میں لے کے چلا ذوقِ تماشا مجھ کو

جس نے افتادگیِ خاک کی نعمت بخشی
اب اٹھائے گی وہی برقِ تجلی مجھ کو

لالہ و گل کا جگر خون ہوا جاتا ہے
سب سمجھتے ہیں جو ناکامِ تماشا مجھ کو

توڑ ڈالے مہ و خورشید ہزاروں میں نے
اس نے اب تک نہ دکھایا رخِ زیبا مجھ کو

بوئے گل بن کے کبھی نغمۂ رنگیں بن کے
ڈھونڈ لیتا ہے ترا حسنِ خود آرا مجھ کو

علم و حکمت کا ہے اس دور میں آوازہ بلند
لا کے دینا تو ذرا ساغر و مینا مجھ کو

ایک میرا ہی فسانہ ز ازل تا بہ ابد
یوں نہ کرنا تھا مرے سامنے رسوا مجھ کو

میں سمجھتا تھا مجھے ان کی طلب ہے اصغرؔ
کیا خبر تھی وہی لے لیں گے سراپا مجھ کو

فروری ۱۹۳۴ء

جوشِ پرواز کہاں جب کوئی صیّاد نہ ہو

اس طرح بھی کوئی سرگشتۂ برباد نہ ہو
اک فسانہ ہوں جو کچھ یاد ہو کچھ یاد نہ ہو

درد وہ ہے کہ جہاں کو تہ و بالا کر دوں
اس پہ یہ لطف کہ نالہ نہ ہو فریاد نہ ہو

ایک مدّت ہوئے تری بزم سے محروم ہوں میں
کاش وہ چشمِ عنایت کبھی تری یاد نہ ہو

مار ڈالے گی مجھے عافیتِ کنجِ چمن
جوشِ پرواز کہاں جب کوئی صیّاد نہ ہو

حوصلے عشق کے پامال ہوئے جاتے ہیں
اب یہ بیداد کہیں حسن پہ بیداد نہ ہو

جون ——— ۱۹۳۴ء

اک گلِ تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا

حُسن کو وسعتیں جو دیں، عشق کو حوصلا دیا
جو نہ ملے نہ مِٹ سکے وہ مجھے مدّعا دیا
ہاتھ میں لے کے جامِ مے آج وہ مسکرا دیا
عقل کو سرد کر دیا رُوح کو جگمگا دیا
دل پہ لیا ہے داغِ عشق کھو کے بہارِ زندگی
اک گلِ تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا
لذّتِ دردِ خستگی، دولتِ دامنِ تہی
توڑ کے سارے حوصلے اب مجھے یہ صلا دیا

کچھ تو کہو یہ کیا ہوا تم بھی تھے ساتھ کیا
غم ہیں یہ کیوں سرور تھا درد نے کیوں مزا دیا

اب نہ یہ میری ذات ہے اب نہ یہ کائنات ہے
میں نے نوائے عشق کو ساز سے یوں ملا دیا

عکس جمالِ یار کا آئینۂ خودی میں ہے
یہ غمِ ہجر کیا دیا مجھ سے مجھے چھپا دیا

حشر میں آفتابِ حشر اور وہ شورِ الاماں
اصغرِ بُت پرست نے زُلف کا واسطا دیا

اگست ۱۹۳۴ء

رشحات

ہے خستگی دم سے رعنائی تخیل
میری بہارِ رنگیں پروردۂ خزاں ہے

مہ و انجم میں بھی انداز ہیں پیمانوں کے
شب کو در بند نہیں ہوتے ہیں میخانوں کے

حشر میں نامۂ اعمال کی پرسش ہے ادھر
اس طرف ہاتھ میں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے

بجھ گئی کل جو سرِ بزم وہی شمع نہ تھی
شمع تو آج بھی سینے میں ہے پروانوں کے

جلوہ ہائے تو بہ تو ہیں سامنے اب کیا کریں
ایک دل ہر لحظہ کھوئیں ایک دل پیدا کریں

کیا یہی لازم تھا ان شوریدگانِ شوق کا
عشق کو پردہ بنائیں حسن کو رسوا کریں

کچھ پتہ بتلا سکے یہ طاقتِ بسمل کہاں
زخم جس کو دیکھنا ہو دیکھ لے قاتل کہاں

محو ہیں سب در پہ اُس کے بندگانِ عاشقی
میں کہاں ہوں، دل کہاں ہے آرزوئے دل کہاں

لذّتِ جوشِ طلب ذوقِ نگاہ پوئے دوام
ورنہ ہم شوریدگانِ شوق کی منزل کہاں

خوب جی بھر کے اُٹھا لے جوشِ وحشت کے مزے
پھر کہاں یہ دشت یہ ناقہ کہاں محمل کہاں

ذوقِ طلب حصول سے جو آشنا نہ ہو — یعنی وہ درد چاہیے جس کی دوا نہ ہو
دیکھا ہے برقِ طور کو بھی فرشِ خاک پر — افتادگیٔ عشق اگر نارسا نہ ہو
ہوائے خوشگوار بھی یارب کبھی کبھی — اتنا تو ہو کہ تلخیٔ غم بے مزا نہ ہو
ہر ہر قدم پہ جلوۂ رنگیں ہے نو بہ نو — خود تشنگیٔ نگاہ جو زنجیرِ پا نہ ہو
چھپا ہوا ہے پردۂ جہاں میں جمالِ دوست — اے شوقِ دید چشم بھی اب وا ہو یا نہ ہو

فروری ۱۹۲۲ء

فارسی اشعار

(۱)

در حریمش امتیازِ ایں و آں بے سود بُود
جانِ مشتاقاں بہ سیر بود و ہم نابُود بُود

ما بہر طرزے کہ می رفتیم شاباشش بُود
او بہر رنگے کہ می آید ہماں مقصود بُود

آرزو پیکر تراش و شوقِ من جاں آفریں
شیخ معاذ اللہ ہمیں مخلوقِ من معبود بُود

من ہم از دیر و حرم صد بہرہ می داشتم
لیک در میخانہ ہر راہے بمن مسدود بُود

در حریمِ عشق ایں رمزِ حیات آموختند
بے زیاں سودے کہ من می خواستم بے سُود بُود

من نوائے خویش را آوردم از جائے دگر
در چمن ہنگامۂ محدود و نامحدود بود

اے کہ تو دریائے خوبی ولے تو نی بحر وجود
لافِ منصوری کہ مے زد قطرۂ بے بود بود

شورشِ عشق و نولائے آتشیں حسنِ بتاں
زندگی جائے کہ می دیدم ہموں موجود بود

تو بہر شغلے کہ می باشی ہماں معبودِ تست
آں شکست و ریخت ہم بُت خانۂ محمود بود

یہ غزل قیام لاہور کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ علامہ اقبال نے اسے سُن کر بہت پسند فرمایا اور خود بھی دو شعر اسی وقت موزوں کرکے دیئے اور ہدایت فرمائی کہ انہیں بھی اپنی غزل کے ساتھ رکھنا

علامہ سر اقبالؒ

چشمِ آدم آں سوئے افلاک نورش ہم نیافت
از خیالِ مہر و ماہ اندیشہ گرد آلود بود

من درونِ سینۂ خود سومناتے ساختم
آستانِ کعبہ را دیدم جبیں فرسود بود

۱۹۲۷ء

(۲)

ہر صدائے کہ بمن می رسد از سازِ من است
اندریں گنبدِ ہستی ہمہ آوازِ من است
خندہ چوں شورشِ دل عشوہ چو بے تابئ جاں
ہر ادائے کہ تو داری ہمہ اندازِ من است

(۳)

زفیضِ ذوقِ رنگیں صد بہارے کردہ ام پیدا
زخونِ دل کہ می جوشد نگارے کردہ ام پیدا
لبے روحانیاں را در کمندِ شوق آوردم
براوجِ عرشِ اعلیٰ ہم شکارے کردہ ام پیدا
زموجِ خونِ دل صد بار من رنگیں قبا گشتم
بخاکِ کربلا ہم صد بہارے کردہ ام پیدا
ز "لا" تسخیر کردم ایں جہانِ ماہ و انجم را
زجوشِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

بلے از جلوہ حسنت جہاں یکسر نمی ماند

بیا اکنوں کہ خود را پردہ دارے کردہ ام پیدا

جہانے را پشش بخشم جہانے را بو جد آرام

دریں خاکسترے حسن شرارے کردہ ام پیدا

منِ مسلم چہ مسلم؟ آنکہ اورا یار مے گوید

پس از عمرے ہمیں زنار دارے کردہ ام پیدا

جہانِ مضطرب را پُر سکوں دانی نمی دانی

چساں در بیقراری ہا قرارے کردہ ام پیدا

نگرائے پیروِ طرزِ جنونِ من! نمے دانی

پسِ محمل نشینے صد غبارے کردہ ام پیدا

من از رنگِ وجودِ خویش اصغرؔ نقشہا چینم

برائے جانِ بجود مست بارے کردہ ام پیدا

مئی ۱۹۳۰ء

(۴)

مرا بس است کہ رنگینیٔ نظر دارم — بگیرِ عالمِ خود عالمِ دگر دارم
خرابِ بادۂ خویشم ہلاکِ ذوقِ خودم — ہجومِ جلوہ بہ اندازۂ نظر دارم
چہ درد و چارۂ درد از کجا نمی دانم — مئے کہ خود بہ رگِ خویش نیشتر دارم
بہ پہلوئے مہ و انجم بساط آرایم — قلندرانہ گہے عزمِ صد سفر دارم
ہزار عشوۂ رنگیں ہزار بار کہن — غمے مخور کہ بہ پہلو دلے دگر دارم
جہانِ دو روزہ و انجامِ زیست خوابِ دوام — بیار بادہ کہ من ہم ازیں خبر دارم
مرا کرشمۂ ساقی چو یاد مے آید — ہزار برق بخرمنایۂ جگر دارم

بیا کہ سوختن و گم شدن بیاموزم
دریں سرائے فنا فرصتِ شرر دارم

دسمبر ۱۹۳۰ء

(۵)

بہ شب ہائے سیاہے چند آہے کردہ ام پیدا
بہ ہر سیّارۂ صد رسم و راہے کردہ ام پیدا

جمالِ لالہ و گُل را ہزاراں رنگہا بخشم
زفیضِ جلوۂ حسنت نگاہے کردہ ام پیدا

تو در قیدِ جہاں پابستہ و صد شکوہ سنجیہا
من از ہر ذرّہ سازے کردہ راہے کردہ ام پیدا

غبار از دامنِ خود بارہا افشاندہ ام اصغرؔ
بہ ہنگامِ جنوں صد مہر و ماہے کردہ ام پیدا

جولائی ۱۹۳۰ء